فتاویٰ سلفیہ

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل)

پس پوچھ لو یاد والوں سے اگر تم نہیں جانتے۔

فتاوی سلفیہ

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ

۱۳۱۹ھ - ۱۳۸۷ھ

۱۹۰۱ء - ۱۹۶۸ء

مکتبہ ترجمان

اہل حدیث منزل ۴۱۱۶ - اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

فہرستِ موضوعات

عرضِ ناشر

اسلام کی اصلی روح کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہیں۔ شرک و بدعات اور اوہام و خرافات اسلامی روح کے منافی عناصر ہیں۔ اسلام کی حقیقی اور اصلی روح کو برقرار رکھنے کے لئے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے ایسے بندے پیدا کئے، جنہوں نے نہ صرف دعوت و تبلیغ اور امر و نہی کا فریضہ انجام دیا، بلکہ اس چشمۂ صافی کی ہر طرح سے حفاظت بھی کرتے رہے۔

اسلامی دعوت کے اہم عناصر میں ایک عنصر دین کے پیچیدہ مسائل میں رہنمائی اور اس کی عقدہ کشائی بھی ہے۔ اس کا ایک اہم جزء فتویٰ نویسی بھی ہے۔

برِصغیر ہند و پاک میں علمائے اہلِ حدیث کی دینی، دعوتی، تبلیغی، تعلیمی، تدریسی، سماجی اور سیاسی خدمات کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ علمی خدمات کے دائرہ میں ان کی فتویٰ نویسی بھی ایک اہم خدمت ہے۔

صرف علمائے اہلِ حدیث ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے صرف قرآن و سنت کے دلائل و شواہد پر مبنی فتویٰ نویسی کو رواج دیا۔ جب کہ اس کے برعکس عموماً شخصی اقوال اور مخصوص فقہی زاویوں سے یہ کام انجام دیا جاتا تھا۔ اور صرف فقہ کی مخصوص کتابوں کا ہی حوالہ دینے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔

برِصغیر کے علمائے اہلِ حدیث کے اولین فتاویٰ جات میں شیخ الکل فی الکل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کے علمی نگارشات "فتاویٰ نذیریہ" کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہ سلسلہ بدستور آج تک جاری ہے۔ حضرت میاں صاحب علیہ الرحمہ کے علاوہ حضرت مولانا شرف الدین محدث دہلویؒ، حضرت مولانا شمس الحق ڈیانویؒ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ، شیخ الاسلام مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ، حضرت مولانا عبدالجبار غزنویؒ، حضرت مولانا عبداللہ روپڑی، حضرت

مولانا محمد گوندلوی' حضرت مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری حفظہ اللہ، حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد اسماعیل سلفیؒ گوجرانوالہ، حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ، حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیفؒ ،حضرت مولانا محمد ادریس آزاد رحمانیؒ حضرت مولانا محمد عاقل رحمانیؒ، حضرت مولانا عبد السلام بستویؒ، حضرت مولانا عبد الصمد رحمانیؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا ابوالبرکاتؒ، حضرت مولانا عبد الجبار شکراویؒ، شیخ الحدیث مولانا شمس الحق سلفی رحمہم اللہ۔ وغیرھم کے فتاوے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

"فتاویٰ سلفیہ" شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ کی ان شگفتہ و دلپذیر تحریروں کا مجموعہ ہے، جو سوال و جواب کی شکل میں جماعت کے مختلف پرچوں، خصوصاً "الاعتصام" لاہور میں شائع ہوتے رہے ہیں اور جن کا تعلق روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے ہے اور ہر آدمی کیلئے اسے جاننا ضروری ہے۔

موصوف کے گہربار قلم اور صاف و شستہ زبان و لہجہ اور سنجیدگی نے اس کی علمی قدر و قیمت میں اور اضافہ کر دیا ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔

مکتبہ ترجمان دہلی کی طرف سے اس کی اشاعت سے روزمرہ کے بہت سارے مسائل کی معلومات کے حصول، مسلک اہل حدیث سے متعلق مختلف شکوک و شبہات کے ازالہ اور قرآن و حدیث کی روشنی میں متعدد دینی مسائل کے سمجھنے میں مدد و معاون ہوگی' جس سے ایک نئی روشنی ملے گی۔ توقع ہے یہ مجموعہ عصر حاضر کے جدید ذہن کو اپیل کرتے ہوئے نئی راہیں کھولے گا۔

دعا ہے کہ رب العالمین اس کو مؤلف' مرتب' ناشر اور قارئین کیلئے باعث خیر و برکت بنائے۔ آمین

خادم العلم والعلماء
عبد الوہاب خلجی
نگراں مکتبہ ترجمان' دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور

محترم مولانا۔ السلام علیکم۔

کیا آپ یہ مطلع فرما کر ممنونِ احسان فرمائیں گے کہ آپ تمام اہلِ وہابیہ کا عقیدہ ہے کہ اگر رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال نماز میں آجائے تو یہ خیال (نعوذ باللہ) گدھے اور بیل کے خیال سے بھی بدتر ہے حالانکہ سورت فاتحہ میں ان نیک لوگوں کا ذکر ہے جن کو نیک اعمال کے بدلے انعامات ملے اور برے لوگوں پر اعمالِ بد کے بدلے عذاب نازل ہوئے اسی طرح التحیات للہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھا جاتا ہے اپنے اور نیک لوگوں پر بھی۔ اور رَبِّ اجْعَلْنِي دعا میں اپنا، اپنی اولاد ماں باپ اور تمام مومنوں کا ذکر آتا ہے۔ یہ ہے ہماری نماز جس میں اچھے سے اچھے اور برے لوگوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ اور درود پاک میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل اور ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی آل پر درود پڑھا جاتا ہے۔

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مکرمی و محترمی! السلامُ علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ آپ کا مکتوب ملا۔ مسرت ہوئی کہ آپ حضرات نے ان مسائل کی تحقیق کرنے کی کوشش فرمائی جو عموماً ہمارے بریلوی علماء اور ان کے حاشیہ نشین عوام سے کہتے رہتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے فریق کو ان کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اور یہ حضرات جلسوں اور منبروں پر ان کا اعلان فرما رہے ہوتے ہیں۔ یہ طریق بہت اچھا ہے اس سے آپ کو بھی بصیرت حاصل ہوگی اور یہ حضرات بھی منبر و مجالس کی ذمہ داریوں کو محسوس کریں گے اور بلا تحقیق دوسروں پر تہمت باندھنے سے پرہیز کریں گے۔ اب جواباً ترتیب وار ہماری گزارشات سنیے۔

(۱) اہلِ وہاب کوئی مذہب نہیں نہ ہی ہم لوگ اہلِ وہاب یا وہابی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ نجد کے ایک مشہور عالم کا نام محمد بن عبد الوہاب تھا۔ اس نے نجد اور قرب و جوار کے علاقوں میں وعظ و نصیحت کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کی۔ لوگوں کو شرک، قبر پرستی، بدعات اور غلط رسوم سے روکا۔ لوگوں نے ان کی

سخت مخالفت کی حتیٰ کہ ان کے والد عبدالوہاب عالم ہونے کے باوجود ان کی مخالفت کرتے رہے کئی سال کی محنت اور ہجرت کے بعد آلِ سعود نے اُن کے ساتھ تعاون کیا۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے اُن کی بات کو سمجھا اور اُن کے والد بزرگوار کو بھی محسوس ہوا کہ ان کا بیٹا صحیح کہتا ہے۔ ان کو طعن کے طور پہ لوگ وہابی کہتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ لوگ حنبلی ہیں۔ فقہ میں وہ امام احمدؒ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ملک میں عام لوگ حنفی ہیں، نجد میں اکثر لوگ حنبلی کہلاتے ہیں۔ وہابی نہ کوئی مذہب ہے اور نہ فرقہ محض ایک تحریک تھی جس کا زور بے دینی کی وجہ سے اب ان علاقوں میں ٹوٹ رہا ہے۔ جس طرح ساری دنیا میں دین داری کم ہو رہی ہے۔ ہمارے بریلوی مولوی جس کے مخالف ہو جائیں اسے وہابی کہہ کر بدنام کرتے ہیں۔ یہ دراصل سنتِ انگریزیہ ہے

ہم لوگ نہ اہلِ وہاب ہیں نہ وہابی۔ ہم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانتے ہیں۔ اور صرف ان کی اطاعت کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چاروں اماموں کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں۔ چاروں فقہی مسالک کو یکساں اور برابر سمجھتے ہیں۔ ان میں جو مسئلہ قرآن و سنّت کے موافق ہو اسے قبول کرتے ہیں۔ اور ان تمام فرقوں سے اپنے آپ کو الگ سمجھتے ہیں۔ قبر پرستی، بت پرستی، پیر پرستی سے پرہیز کرتے ہیں اور اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتے ہیں۔ قبروں اور خانقاہوں پر میلوں اور عرسوں کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ اور بزرگوں کو اس طرح فروخت کرنا اور اپنا پیٹ پالنا گناہ خیال کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں تصور کرنا یا نہ کرنا یہ عقائد کا مسئلہ نہیں۔ عقائد کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ عقائد کی مشہور کتابیں شرح عقائد نسفی، عقیدہ طحاویہ، شرح عقیدہ اصفہانیہ، عقیدہ صابونیہ، خیالی، عبدالحکیم، شرح مطالع ہیں۔ یہ عقائد کی کتابیں عام کتب خانوں میں ملتی ہیں کسی میں یہ عقیدہ موجود نہیں۔ معلوم نہیں بریلوی مولوی صاحبان نے یہ عقیدہ کہاں سے بنایا۔ صحیح بات یہ ہے کہ نماز خشوع اور عاجزی سے پڑھی جائے۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے مفہوم و مطلب کی طرف توجہ رکھنی چاہیے۔ باقی پریشان خیالات سے ہر نمازی بچنے کی کوشش کرے اگر خیالات دل میں آئیں تو دل میں آعوذ یا لاحول پڑھے اور خیالات کی آمد کو روکے۔

غلطی کی وجہ

قریباً ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے ایک بزرگ سید احمد بریلوی ہوئے۔ یہ حنفی المذہب تھے۔ نہایت پرہیزگار ولی اللہ تھے۔ انہوں نے سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ جہاد کا فیصلہ کیا۔ بہت سے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بڑے بڑے عالم بھی ان کے مرید تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا اسمٰعیل بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ اور مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی حنفی اُن کے عقیدت مند تھے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب اہلحدیث تھے۔ سید احمد صاحب حنفی بریلوی صوفی بزرگ تھے۔

انھوں نے تصوف میں ایک کتاب لکھوائی جس کا نام "صراطِ مستقیم" ہے۔ یہ کتاب فارسی میں ہے۔ اس کے چار باب ہیں اس کے دو باب کا ترجمہ مولوی عبدالحی صاحب بڈھانوی حنفی نے کیا ہے اس کے دوسرے باب ہیں جس کا ترجمہ مولانا عبدالحی صاحب نے کیا ہے۔ ایک ایسی عبارت موجود ہے جس میں بریلوی حضرات کو مغالطہ ہوا اور وہ عبارت کو صحیح نہیں سمجھ سکے۔ اصل عبارت اور اس کا مفہوم آگے آئے گا لیکن مہربانی فرما کر آپ دو چیزیں ذہن میں رکھ لیں۔ سید احمد بریلویؒ بھی حنفی ہیں اور مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی بھی حنفی ہیں۔ شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نہ اس کتاب کے مصنف ہیں نہ اس باب کے مترجم۔ یہ تو تاجر کتب حضرات کی ہوشیاری ہے کہ انھوں نے شہرت کی وجہ سے کتاب پر شاہ اسمٰعیل صاحب کا نام لکھ دیا اور بریلوی حضرات کی لاعلمی کا نشانہ بن گئے۔ حالانکہ وہ بے چارے بالکل بے قصور ہیں اور شاہ صاحب کے نام اور اہلِ حدیث ہونے کی وجہ سے جماعتِ اہلِ حدیث بھی بدنام ہوگئی حالانکہ ہماری کسی کتاب میں یہ مسئلہ مرقوم نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم ان بزرگوں کو اختلافِ مسلک کے باوجود نیک اور بزرگ سمجھتے ہیں لیکن ان کو پیغمبر یا اپنا امام نہیں مانتے ان میں سے بعض حضرات کی اور بھی تصنیفات ہیں جن میں ہر قسم کے مسائل پائے جاتے ہیں ان میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔ ہم ان حضرات میں سے کسی کے مقلد نہیں ان کو اچھے عالم اور بزرگ سمجھتے ہیں۔ بریلوی حضرات معلوم نہیں یہ غلط بیانی کیوں کرتے ہیں کہ یہ حضرات ہمارے امام ہیں۔ آپ یقین فرمائیں ان کی کتابیں ہمارے لیے حجت ہیں نہ یہ بزرگ ہمارے امام۔ اب ہمارا فرض نہیں کہ ہم اصل عبارت کی تشریح کریں یا مغالطہ کا اظہار لیکن آپ کی تسکین کے لیے اصل عبارت اور اس کا مطلب عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

سید احمدؒ کا مقصد یہ ہے کہ نماز پوری توجہ سے ادا ہونی چاہیے اس میں خیالات اور وسوسوں کو قریب نہیں آنے دینا چاہیے۔ خصوصاً ایسے خیالات جن سے خدا تعالیٰ کی بزرگی اور عظمت میں فرق آئے۔ کیونکہ عبادت میں پہلی چیز خدا تعالیٰ سے محبت اور اس کی عظمت اور برتری ہے اور دوسری چیز عبادت میں انسان کا عجز و انکسار اور حاجت مندی کا اظہار ہے۔ ان دو چیزوں میں جن خیالات سے نقص پیدا ہو اللہ کی عزت و برتری میں فرق آئے یا انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اس کے دل میں تکبر آجائے وہ خیالات درست نہیں۔ عبادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بطور عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ آئے تو کوئی حرج نہیں اس لیے کہ یہ اللہ کی عظمت سے نہیں ٹکراتا بلکہ اس میں ان کی عبدیت اور رسالت کا اقرار ہے۔ اسی طرح مغضوب اور منعم علیہ گروہوں کے خیال سے بھی اللہ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ انعام بھی احتیاج ہے ہو غضب میں ان نافرمانیوں کی تحقیر ہے۔

اس لحاظ سے یہ خیال اللہ کی عظمت سے نہیں ٹکراتا لیکن اگر کسی ولی، بزرگ یا نبی کا خیال آجائے تو ان کی عظمت، ان کی بزرگی کا خیال اور تصور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی سے ٹکرائے گا۔ آپ نہ اس کے لیے

اعوذ پڑھ سکتے ہیں نہ لاحول ۔ اس کے خلاف اگر بیل گدھے یا کسی ذلیل اور حقیر چیز کا خیال آجائے آپ فوراً لاحول یا اعوذ پڑھ کر اسے دور کر دیں گے ۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور عزت اس سے متاثر نہیں ہوگی ۔ سید صاحبؒ کا مقصد یہ ہے وسوسہ کوئی بھی نماز میں آنا نا چاہیے نہ ہی لانا چاہیے لیکن بعض وسوسے نماز میں زیادہ خلل پیدا کرتے ہیں بعض کم ۔ صوفیانہ لحاظ سے سید صاحب نے واقعی عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے لیکن کند ذہن آدمی جو اتنی گہرائی تک نہ جا سکے وہ کفر کے فتوے لگانا شروع کر دے گا ۔ مقابلہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور گاؤ وخر میں نہیں ۔ مقابلہ وسوسے کے نقصان اور مضرت میں ہے ایک شخص کہتا ہے کہ گرم لوہا جلانے کے لحاظ سے گرم پانی سے زیادہ مضر ہے ۔ مقابلہ لوہے اور پانی کی قیمت میں نہیں ہوگا بلکہ لوہے اور پانی میں گرمی کی تاثیر کا ہوگا ۔ سید صاحبؒ نے اس عمیق اور لطیف بات کو سمجھانے کے لیے متعدد صفحے لکھے ہیں ۔ لیکن بریلوی علماء کا بغض ذہن پہ سچی بات سمجھنے میں حائل ہو گیا ۔ سید صاحبؒ کی پوری بات سمجھنے کے لیے اگر آپ پسند فرمائیں تو اصل کتاب بھیجدوں ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کا ذہن کھول دے ۔ سید صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ طبائع کے لحاظ سے وسوسے کا اثر ہر طبیعت پر مختلف ہوتا ہے ۔ حضرت عمرؓ ایسے بزرگ نماز میں لشکر مرتب فرما لیتے تھے ۔ ان کی نماز میں ان کے خشوع پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے بزرگوں اور اہل اللہ کی ریس کر کے اپنی نماز نہیں خراب کرنی چاہیے ۔

سید صاحبؒ نے وسوسے کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں ۔ ایک وسوسہ لاعلاج ہے اس کے لیے یا تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے یا کسی کامل پیر کی صحبت میں کچھ عرصہ گزارے ۔ دوسرا قابلِ علاج ہے ۔ اس کا علاج ذکر فرمایا ہے ۔ سید صاحب فرماتے ہیں ۔ " اور جو کچھ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ نماز میں سامانِ لشکر کی تدبیر کیا کرتے تھے ۔ سو اس قصہ سے مغرور ہو کر اپنی نماز کو تباہ نہ کرنا چاہیے ۔ ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

حضرت خضر علیہ السلام کے لیے کشتی توڑنے اور بے گناہ بچے کو مار ڈالنے میں بڑا ثواب تھا اور دوسروں کے لیے نہایت درجہ کا گناہ ہے ۔ جناب فاروقؓ کا وہ درجہ تھا کہ لشکر کی تیاری آپ کی نماز میں خلل نہیں ڈالتی تھی[1] ۔ اس لیے کہ وہ تدبیر اللہ جل شانہ کے الہامات سے آپؓ کے دل میں ڈالی جاتی تھی ۔ اور جو شخص خود کسی امر کی تدبیر

---

[1] مگر یہ علی الاطلاق صحیح نہیں بلکہ بعض اوقات اس قسم کے خیالات حضرت عمرؓ کی نماز میں بھی خلل ڈال دیتے تھے ۔ چنانچہ ہمام بن حارث روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے مغرب کی نماز پڑھائی اور قرأت چھوڑ گئے فارغ ہونے کے بعد نمازیوں نے کہا آپ قرأت چھوڑ گئے ہیں ۔ فرمایا میں ایک تجارتی قافلہ کے متعلق سوچ رہا تھا جسے میں نے مدینہ سے رخصت کیا اور شام تک پہنچایا پھر دوبارہ قرأت کے ساتھ نماز پڑھائی اور فرمایا جس نماز میں قرأت نہیں وہ نماز نہیں ۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کی طرف متوجہ ہو خواہ وہ امر دینی ہو یا دنیاوی تو یہ صورت بالکل اس کے خلاف ہے اور جس شخص پر یہ مقام کھل جاتا ہے وہ جانتا ہے ہاں بمقتضائے ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ زنا کے وسوسے سے اپنی بیوی سے مجامعت کا خیال بہتر ہے اور شیخ یا اس جیسے اور بزرگوں کی طرف خواہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں اپنی ہمت کو لگا دینا اپنے بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے سے زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ شیخ کا خیال تو تعظیم اور بزرگی کے ساتھ انسان کے دل میں چمٹ جاتا ہے اور بیل اور گدھے کے خیال میں نہ تو اس قدر چسپیدگی ہوتی ہے نہ تعظیم بلکہ حقیر اور ذلیل ہوتا ہے اور غیر کی یہ تعظیم اور بزرگی شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ ماحصل کلام یہاں وسوسوں کے تفاوت کا بیان کرنا مقصود ہے الخ" اصل کتاب فارسی میں ہے میں نے بقدر ضرورت ترجمہ نقل کر دیا ہے۔

سید صاحب یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگوں کی عظمت اور بزرگی کا ذکر کرتے ہیں۔ بریلوی مولوی صاحبان نے اسے توہین بنا ڈالا سمجھ الٹ جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ۔

اس امر پر تمام مسلمان متفق ہیں کہ نماز خشوع اور انابت سے ادا کرنی چاہیے۔ وسوسے اور خیالات نماز میں نقصان پیدا کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ سید صاحبؒ نے ذکر فرمایا۔ سید صاحبؒ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ردّی اور حقیر چیزوں کا خیال اس لیے زیادہ مضر نہیں کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ معزز اور محبوب چیزیں زیادہ مضر ہیں کہ ان کی عزت اور محبت دل پر غالب ہوتی ہے۔ آپ ان بریلوی علمائے کرام سے فرمائیں کہ ان کے ہاں کیا صورت ہوگی۔ کیا گاؤخر کے تصور سے نماز میں صرف نقص پیدا ہوگا اور بزرگوں کے تصور سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یا بریلوی حضرات خشوع کی نماز میں ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ آپ کے ہاں کافر، مشرک، یہودی، عیسائی، مجوسی کے تصور میں فرق نہیں سب یکساں ہیں۔ آپ کے سوال کے آخری حصہ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرات مغضوب علیہم اور منعم علیہم، کفار مشرکین اور صالحین سب کے تصور کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے سوا آپ کے ہاں کوئی چارہ ہی نہیں۔ بہرحال سید صاحبؒ نماز میں خشوع ضروری سمجھتے ہیں اور خیالات اور وسوسوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ وسوسوں میں بھی فرق کرتے ہیں۔ بعض زیادہ مضر اور بعض کم۔ اور اس میں مقابلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات اور (معاذ اللہ) گاؤخر میں نہیں بلکہ اچھے اور برے، مُضر اور کم مُضر وسوسوں میں مقابلہ ہے۔

(گذشتہ سے پیوستہ) فاروق اعظم سے ثقہ راویوں نے یہ واقعہ مختلف الفاظ سے نقل کیا ہے جسے حافظ ابن حجر نے مختلف حالات پر محمول کیا ہے۔ (فتح الباری طبع دہلی جز خامس صـ ۱۳۲) محمد اسحٰق عفی عنہ

ایک فقہی نظیر ذہن کو صاف کرنے کے لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کی ایک دو تصریحات پر غور فرمائیں۔

لو نظر المصلی الی المصحف وقرء فسدت صلوته لا الی فرج امرءة لشهوة لان الاول تعليم وتعلم فيها لا الثاني۔
(الاشباہ والنظائر صفحہ ۴۲)

اگر نماز پڑھنے والا قرآن میں دیکھ کر پڑھے تو اس کی نماز احناف کے نزدیک، فاسد ہو جائے گی کیوں کہ اس میں تعلیم و تعلم ہے لیکن اگر عورت کی شرم گاہ کو شہوت سے دیکھے تو نماز فاسد نہیں ہو گی۔

مولوی احمد رضا صاحب لکھتے ہیں: "اگر عورت کو طلاق رجعی دی تھی۔ ہنوز عدت نہ گزری یہ نماز میں تھا کہ عورت کی فرج داخل پر نظر پڑ گئی اور شہوت پیدا ہوئی پھر رجعت ہو گئی اور نماز میں فساد نہ آیا۔ (فتاوی رضویہ صفحہ ۶۷ ج ۱)

مولوی صادق صاحب اور دوسرے بریلوی مولوی صاحبان سے دریافت فرمائیں کیا شرمگاہ قرآن سے افضل ہے۔ قرآن سے نماز فاسد ہے شرم گاہ کے ملاحظہ سے نماز پہ کوئی اثر نہ پڑے۔ شامی مراقی الفلاح میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے جو توجیہ آپ کے بزرگ اس کے لیے کریں گے اس قسم کا عذر سید احمد شہیدؒ کے لیے بھی ہو گا۔

دوسرا مسئلہ قال امام بعد شهر كنت مجوسيا فلا اعادة عليه ولو قال صليت بغير وضوء او في ثوب نجس اعادوا ان كان متيقنا ه
(الاشباہ صفحہ ۴۲)

اگر امام ایک ماہ امامت کے بعد کہتا ہے کہ میں مجوسی تھا مقتدی کو نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں لیکن اگر امام کہے کہ میں نے بے وضو، یا پلید کپڑے میں نماز پڑھائی ہے تو بصورت بے وضو نماز لوٹانی پڑے گی۔

اب اگر آپ پر یہ الزام لگایا جائے کہ آپ مجوسی آتش پرست کو بے وضو مسلمان سے بہتر سمجھتے ہیں آپ اسے پسند کریں گے؟ اگر یہاں فقہا رحمہم اللہ کی توجیہات صحیح سمجھی جا سکتی ہیں تو سید احمد صاحبؒ کے ارشاد کی بھی توجیہ ہو سکتی ہے۔ آپ اپنے علماء سے دریافت فرمائیں۔ مجھے خطرہ ہے اگر آپ نے مسائل میں تحقیق شروع کی تو محلہ میں آپ کا مقاطعہ کرایا جائے گا۔ اور مسجد میں آپ کا داخلہ بند ہو جائے گا۔

ہم [illegible] چاروں ائمہ اربعہ اور فقہائے مذاہب کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں، ان کے علوم سے فائدہ اٹھاتے ہیں [illegible] شہیدؒ اور مولانا عبد الحی صاحبؒ کو بھی باوجود حنفی ہونے کے اپنا بزرگ اور عالم سمجھتے ہیں۔ ان کی [illegible] مطالعہ کے مطابق ہوں انہیں قبول کرتے ہیں جو سمجھ میں نہ آئیں انہیں نظر انداز کر دیتے

ہیں لیکن ان کو برا بھلا نہیں کہتے۔ نہ ہی ان کو انبیاء کی طرح واجب الاطاعت جانتے ہیں۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا

میں آخر میں آپ کا پھر شکر گزار ہوں کہ آپ نے تحقیق کرنے کی جرأت فرمائی اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (الاعتصام۔ ۳، نومبر ۱۹۶۷ء)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم پیدائش اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ

اسلام کے مزاج کا تقاضا ہے کہ وہ اشخاص سے زیادہ ان کارناموں کی عزت کرتا ہے جو کسی بڑے شخص سے صادر ہوں۔ اسی لیے صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور آئمہ ہدیٰ میں سے کسی نے بھی کسی بڑے آدمی کا جنم دن یا موت کا دن منانے کی کوشش نہیں فرمائی۔ اس رسم کی اسلام میں اگر کچھ اہمیت ہوتی تو اکابر صحابہؓ کی پیدائش کے دن ضرور ہی منائے جاتے۔

عوام نے پیدائش کے دن کو میلاد سے تعبیر کیا اور موت کے دن کو عرس کا نام دیا لیکن یہ رسم صدیوں بعد بنائی گئی۔ اور عموماً ایسی رسوم کا اہتمام وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں ان سے کچھ نہ کچھ مالی فائدہ ہوتا ہو عوام بےچارے عقیدت کی وجہ سے خسارے ہی میں رہتے ہیں۔

ابتدائے اسلام سے اکابر اسلام کی پیدائش اور موت کے دن منانے کا اہتمام کیا جاتا تو شاید سال کا کوئی دن بھی کسی میلاد شریف یا عرس شریف سے خالی نہ ہوتا۔ امت میں بحمد اللہ پاک لوگوں کی کمی نہیں تھی اگر ان کے واقعات اور حوادث کو بطور ایام منایا جاتا تو یقیناً بہت سے ضروری اور اچھے کاموں کے لیے وقت ہی نہ بچتا۔ سارا وقت مرنے والوں کے احترام اور اہتمام میں گزر جاتا۔ زندوں کی اصلاح اور تعمیر کے لیے شاید ہی تھوڑا بہت وقت نکلتا۔ رجال، سیرت اور وفیات کی کتابوں میں اپنے اکابر کے تذکرے پڑھیے اور پھر ملاحظہ فرمایئے کیا ان سب حضرات نے اعراس اور موالید کے اہتمام فرمائے۔؟ شائد گدی نشین اور ملا حضرات تو اس کاروبار کو کر گزریں کہ انہیں اس سے کافی حد تک معاشی سہولتیں میسر آجاتی ہیں لیکن عامۃ المسلمین کے لیے اس میں بے کاری اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ رسم اہل اسلام میں غیر مسلم قوموں کی تقلید سے آئی۔ مغربی قومیں غالباً پیدائش کے دن مناتی ہیں مگر مشائخ اور اکابر کے مرنے پر ان کے ہاں بھی عرس کا کوئی انتظام نہیں۔ عرس کی رسم شاید ہندوؤں میں بھی نہ ہو۔ بہرحال دو کا ندار قسم کے متاخر صوفیوں نے ایجاد کی جس کا نتیجہ قبر پرستی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

محفلِ میلاد یہ وہ چیز ہے جسے ان حضرات نے کفر اور اسلام میں فرق کرنے والی شے تصور کیا ہے کہ جو اس رسم میں شریک نہ ہو اسے ابلیس کا ساتھی سمجھتے ہیں۔ آج کل یہ رسم بھی غیر مسلم فرقوں کی نقالی میں منائی جارہی ہے قرونِ خیر اور آئمہ اسلام سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کم علم ملا اسے غیر مسلموں کی تقلید ہی میں مناتے ہیں۔ حافظ ابوشامہ (متوفی ۶۶۳ھ) نے الباعث علی انکار البدع والحوادث میں فرمایا:۔

اول من فعل ھذا بالموصل الشیخ عمر	یعنی سب سے پہلے میلاد منانے کا فعل
بن محمد الملا احد الصالحین المشھور کان	ملا عمر بن محمد نے جو مشہور نیک آدمی
وبہ اقتدی صاحب اربل ۔	تھا۔ شروع کیا۔

واضح رہے یہ بدعت قریباً ۶۰۴ھ میں ایجاد ہوئی۔

ملا عمر بن محمد موصل کے رہنے والے تھے اربل موصل کے قریب ہے یہاں کے رئیس ابوسعید مظفر الدین ابوالحسن علی بن بکتگین نے اسے بہت نمایاں کیا اور اس بدعت کو بہت فروغ دیا۔ مورخ ابن خلکان ملک مظفر الدین کوکبوری کے بہت ہی ممنون معلوم ہوتے ہیں کہ انہوں نے اسے کافی پھیلا کر ذکر کیا ہے اور اس کے محاسن میں لکھتے ہیں۔

لم یکن لہ لذۃ سوی السماع فانہ	وہ سماع سے محظوظ ہوتا تھا اور برائیوں
کان لا یتعاطی المنکر (ابن خلکان ص۲۳۶ ج۲)	کو پسند نہیں کرتا تھا۔

اس کے بعد ابنِ خلکان نے محفلِ میلاد کا مبسوط تذکرہ مزے لے لے کر لیا ہے فرماتے ہیں:۔

اوائلِ محرم میں بغداد، موصل، جزیرہ، سنجار، نصیبین اور عجم کے شہروں سے فقیہ، صوفی، واعظ قاری اور شاعر آنے شروع ہو جاتے تھے۔ اور ملک مظفر الدین ان کے لیے چار چار یا پانچ پانچ منزل لکڑی کے خیمے لگوا تا تھا۔ سب سے بڑا خیمہ بادشاہ کا ہوتا باقی ارکانِ دولت کے خیمے ہوتے اور اوائلِ صفر میں انہیں سجایا جاتا اور مغنی اور ڈرامہ کرنے والے، مختلف قسم کے کھلاڑی یہاں فروکش ہوتے اور لوگ کاروبار ترک کرکے ان محفلوں میں مشغول ہوجاتے اور بادشاہ ہر خیمہ کے پاس سے عصر کے بعد گزرتے گانا سنتے اور ڈرامہ دیکھتے۔ تمام رات گانا سننے کے بعد صبح شکار کے لیے چلے جاتے اور میلاد ایک سال ۸ ربیع الاول کو مناتے اور ایک سال ۱۲ ربیع الاول کو — یہ اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت میں اختلاف ہے۔ پھر اونٹ اور گائے اور بکریاں سجا کر نکالتے اور ان پر طبل اور گانے بجانے کا سامان لاد کر میدان میں لے آتے پھر انہیں ذبح کرکے پکانا شروع کر دیتے۔ پھر میلاد کی رات

سماع کی محفلیں گرم ہوتیں اور شمعیں جلائی جاتیں۔ میلاد کی صبح صوفی صاحبان کو قطار در قطار میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر خلعتوں کے بقچے رکھ دیتے اور بادشاہ لکڑی کے خیمہ لگانے والوں اور صوفی صاحبان اور ان کے ساتھ فوجوں کا نظارہ دیکھتے (ص ۱۳۷ ج ۲)

اس بادشاہ کے عہد میں ابو الخطاب عمر بن دحیہ بن خلیفہ نے ایک کتاب — التنویر فی مولد السراج المنیر — لکھی جس میں موضوعات اور اکاذیب جمع کیے اور ایک ہزار روپیہ انعام پایا۔

اور یہ کوکبوری جب حلوہ یا کوئی میوہ کھاتے تو بقیہ ان صوفی فقراء اور شیوخ کو بھیج دیتے۔ اور اکیلے کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ مظفر الدین کوکبوری کا انتقال ۶۳۰ھ میں ہوا۔ یہ بدعت ساتویں صدی ہجری کے شروع میں یا چھٹی صدی کے آخر میں شروع ہوئی۔ حافظ ابن کثیر نے ۶۳۰ھ کے واقعات میں مظفر الدین کوکبوری کے تذکرہ میں وہاں کے بعض مصارف کا ذکر کیا ہے۔ پانچ ہزار بکرا بھنا ہوا، دس ہزار مرغی، ایک لاکھ پرندہ تیس ہزار پلیٹ حلوہ شریف اور بڑے بڑے صوفی صاحبان اس محفل میں شریک ہوتے۔ ظہر سے صبح تک قوالی ہوتی۔ صوفی صاحبان قوالی سنتے اور ناچتے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں مظفر الدین اس محفل پر ہر سال تیس ہزار دینار صرف کرتے تھے۔

کوکبوری "سنت"

مروجہ محفل میلاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ سے ثابت نہیں البتہ اس کو مظفر الدین کوکبوری اور ملا عمر بن محمد کی سنت سمجھنا چاہیے نیز یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس میں مزید کچھ اضافے ہوتے چلے جائیں گے۔ کوکبوری نے تو اتنا کرم کیا کہ شہر سے باہر میدان میں یہ میلاد رچایا جس کا جی چاہا چلا گیا جس نے ناپسند کیا، نہ گیا۔ اب بازاروں کا چکر کاٹنا — یہ اضافہ غالباً مرحوم عبد المجید قرشی مقیم پٹی نے کیا — اور ہمارے ملا حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کی شبیہ اور قوالیوں کے ساتھ فلمی گانوں کا اضافہ کر کے اس تماشہ کو دوآتشہ کر دیا ہے حکومت نے ملا حضرات کے لیے کھانے کا تو انتظام نہیں کیا البتہ اسے جاہل امیروں کے سپرد کر کے خود الگ ہو گئی۔ اور صورت یہ ہو گئی ہے کہ کوکبوری سنت پر عمل فرماتے ہوئے اس میں ناچ اور رقص کا اور اضافہ ہو گیا۔ اور بڑے بڑے سفید ریش ملا صاحبان بیل گاڑیوں پر تشریف رکھے ہوئے ناچتے اور رقص کرتے ہیں۔

دُور اندیش اہلِ علم

اس پر جہاں گوشت اور حلوہ کے عاشق کوکبوری سنت پر عمل کرتے ہوئے اربل کی اس محفل میں شکم پروری کے لیے پہنچے تھے وہاں دور اندیش اور سنتِ نبوی پر عمل کے عاشق اس ہنگامۂ لہم وشیرینی کے خلاف تنقید کا بھی فرض انجام دیتے رہے

تھے ۔ مثلاً علامہ ابن الحاج اور شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ اور علامہ شاطبی مؤلف "الاعتصام"، وغیرہم رحمہم اللہ ۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن محمد بن محمد العبدری المتوفی ۷۳۰ھ المعروف بابن الحاج نے اس بدعت کے متعلق تفصیلاً لکھا ہے اور ساتویں صدی کے اواخر تک محفل میلاد کے ضمن میں جس قدر بدعات رونما ہو چکی تھیں اُن کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے ۔

(فصل فی المولد) ومن جملة ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذالك من اکبر العبادات واظهار الشعائر ما یفعلونه فی شهر ربیع الاول من المولد وقد احتوی علی بدع ومحرمات جملة فمن ذالك استعمالهم المغانی ومعهم آلات الطرب من الطار المصرصر وغیر ذالك مما جعلوه آلة السماع ۔ الخ

(المدخل لابن الحاج صہ ۲۶۱ ج ۱)

لوگوں کی پیدا کردہ بدعات سے ایک بدعت محفلِ مولد بھی ہے ۔ جسے یہ ربیع الاوّل میں رچاتے ہیں ۔ اور محفل قوالی کے علاوہ طنبور طار اور دوسرے گانے بجانے کے آلات استعمال کرتے ہیں ۔ جو محرمات میں شامل ہیں ۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :-

"بعض لوگ اس گانے بجانے کے بجائے قراء اور فقراء کو کھانا کھلاتے ہیں لیکن یہ کھانا مسکین کی خدمت کے ارادہ سے نہیں بلکہ مولد کی نیت سے ہوتا ہے لہٰذا یہ بھی بدعت ہے ۔ (قال فقال انه اذا اطعم الاخوان لیس الا بنیة المولد ان ذالك بدعة"

"بعض لوگ اس دن بخاری پڑھتے ہیں ۔ گو حدیث پڑھنا پڑھانا بہت بڑا عمل ہے لیکن خاص اسی دن میں اس نیت سے کیا جائے تو یہ بھی بدعت ہے ۔"

"بعض لوگ بعض رسوم اور دستور کے مواقع پر اپنے دوستوں کو تحفوں کے طور پر روپے دیتے ہیں اب واپس مانگتے شرماتے ہیں تو وہ محفلِ میلاد کے بہانہ سے اپنا روپیہ وصول کرتے ہیں ۔"

اس کے بعد ابن الحاج نے مولد کے بہانہ سے جمع زر کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں اور ان سب کو بوجوہ حرام اور گناہ لکھا ہے ۔ (صہ ۲۸)

اس کے علاوہ بھی بہت سے علماء نے اس عمل کو بدعت اور حرام لکھا ہے اگر ضرورت ہوئی تو آگے

تفصیل کسی دوسرے موقعہ پر دی جائے گی۔

معلوم ہو چکا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز (۶۰۰ھ) میں یہ بدعت شروع ہوئی۔ صدی ختم ہونے تک اس میں بیسیوں قسم کے منکرات پیدا ہو گئے۔ اور پھر برسوں تک یہ بدعت متروک رہی۔ اب انگریز کے آخری دور میں ہندوؤں کے بزرگوں کے جنم دن کی تقلید میں اسے پھر سے شروع کیا گیا۔ حکومت نے لاعلمی کی وجہ سے اسے دین کا مسئلہ سمجھ کر اس میں نیم سا تعاون کیا۔ اب ملا حضرات نے پھر اسی پیٹ کے دھندے کو اپنا کر پیٹ اور محفل کی رونق کا سامان مہیا کر دیا ہے حالانکہ آج کل اس میں اور مفاسد پائے جا رہے ہیں مثلاً عورتوں کی بے آبروئی اور فواحش کی گرم بازاری، اسی طرح یہ محفل بدکاری کا پیش خیمہ بن رہی ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت کے نام پر فسق و فجور کو رواج دیا جا رہا ہے۔

کم علم ملا حضرات اپنے انتقامی جذبات کی تسکین بھی اسی بہانہ سے کر لیتے ہیں۔ بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر اہلِ توحید کی مساجد اور مجالس کے سامنے ہنگامہ آرائی کر کے بداخلاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ حکومت کے تعاون کی آڑ میں ہو رہا ہے۔

میرے نزدیک یہ فعل بدعت ہے اس میں کتنی بھی تقدیس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے میں اسے گناہ سمجھتا ہوں لیکن ہم ایسے اسلامی ملک میں رہ رہے ہیں جس کے حکام اور ارباب اقتدار اسلام کی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ یہاں ان بدعات کو اسلام پسندی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے پھر اس میں فواحش کا ارتکاب ہوتا ہے اور ہم ان کو بجبر روکنے پر قادر نہیں۔

اندریں حالات اصل مطالبہ تو ہمارا یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت پاکستان کو اسلام کے خلاف سب چیزیں بند کر دینی چاہییں لیکن عوام اگر اپنے کم علم مولویوں کے بہکاوے میں آ کر ان غیر اسلامی اشغال و اعمال کو اسلامی قرار دینے پر ہی مُصر ہیں تو حکومت میں پڑھے لکھے لوگ بھی آخر موجود ہیں انہیں اصل حقیقت کو سمجھ کر اس پر عمل کرانے کے لیے انتظامیہ کی مشینری کو حرکت میں لانا چاہیے لیکن ظاہر ہے کہ ارباب اقتدار کو مذکورہ بالا ظاہری باہر ات کا موجودہ حالات میں باور کرانا سخت مشکل ہے۔ اس لیے پچھلے دنوں میں نے ایک پمفلٹ کا نفاذ ننگر یا کہ نفسِ مسئلہ سے قطعِ نظر صرف معاشرتی نقطہ نظر سے ارباب اقتدار کو جھنجھوڑنے کی کوشش ... سے ہمدردی و خیر خواہی کیں جن سے مقصد یہ تھا کہ اس گناہِ عظیم کو کسی وجہ سے حکومت اگر فوری طور پر روک نہیں سکتی تو اس کو کم از کم اپنے اور ہر شریف آدمی کے نقطۂ نگاہ سے ہی دیکھا جائے کہ اس بدعات کے ساتھ منکرات اور فواحش کی دن بدن کثرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور بہت سی قومی دولت بھی ضائع کی جا رہی ہے۔ بہر صورت اس پر بھی قدغن نکالی جائے۔

نیز ان بدعاتِ شنیعہ سے بدکاری اور عریانی کے ان نئے رجحانات کو بھی خارج کیا جائے تاکہ برائی کے دلدادہ اور بد قماش لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ نہ مل سکے۔

علاوہ ازیں ان بدعات کی تبلیغ و اشاعت ایسے انداز سے جاہل ملاؤں کا ایک طبقہ کرتا ہے جس سے مسلمانوں میں تفرقہ بڑھتا ہے اور فرقہ وارانہ تعصب کی آبیاری ہوتی ہے اور ظلمات بعضھا فوق بعض کے مصداق برائی کی تہوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اس ضمن میں میری رائے بالکل واضح ہے کہ عوام کے سامنے میلاد کی محفلوں کے بدعت ہونے کی وضاحت تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سے ضرور کی جائے اور بحمد اللہ ہماری جماعت نے بالخصوص ہمیشہ کی ہے لیکن جو لوگ اس بدعت کو چھوڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوں تو ان کو اس پہ آمادہ کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے کہ خدا کے لیے فواحش، عریانی، قومی دولت کے ضیاع اور تفرقہ پردازی سے تو یہ عاشقانِ رسول" ان محفلوں کو بچائے رکھیں۔ ع

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

(الاعتصام: ۱۴ ستمبر ۱۹۶۲ء)

میلاد کی شرعی حیثیت

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ — القرآن — تا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

ان آیات میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو آنے والے رسول کی بشارت دی اور ان کا اسم گرامی بھی بتلایا۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل اس وقت سے لے کر برابر آپؐ کے انتظار میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے یحییٰ علیہ السلام سے بھی دریافت کیا، آیا تو وہ نبی ہے؟ تو انہوں نے انکار کر دیا۔ دوسری طرف قبائل عرب اپنی باہمی آویزش کی بنا پر بھی شدید منتظر تھے کہ آخری رسولؐ کی رفاقت میں ہم اپنے حریفوں پہ غالب آکر سیاسی اور ملکی اقتدار حاصل کر لیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نومولود بچوں کا نام اس امید پر محمد رکھتے کہ شاید یہی وہ موعود پیغامبر ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ کی بشارت اور ولادت کے درمیانی زمانہ میں سات اشخاص محمد نامی ہو چکے ہیں۔ احمد اور محمد دونوں ناموں سے کتب سابقہ میں آپؐ کا تذکرہ ملتا ہے۔

بشارتِ عیسیٰ کی تصدیق جب سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور دعوائے نبوت و رسالت کیا تو ایک موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

انا محمد و انا احمد و انا العاقب
انا دعاء ابی ابراھیم و بشارۃ عیسٰی

میں ہی محمدؐ ہوں۔ میں ہی احمدؐ ہوں اور میں ہی سب سے آخر میں آنے والا نبی ہوں۔ میں ہی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا مظہر ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔

اس شہرہ و انتظار کے باوجود تاریخ ولادت میں اختلاف پتہ دیتا ہے کہ اس قسم کے موالید اور ایام اسلام کے مزاج سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے۔

تاریخ ولادت میں اختلاف آپؐ کی تاریخِ ولادت میں کئی اقوال ملتے ہیں۔ ایک جگہ ربیع الاوّل کی دو تاریخ مذکور ہے۔ آٹھ کی بھی صراحت ہے۔ دس، بارہ، تیرہ اور ستائیس کا بھی ذکر آیا ہے۔ ان سب تاریخوں میں آٹھ ربیع الاوّل زیادہ راجح ہے۔

روایاتِ متعلقہ ولادت کا غلط ہونا آج کل ہمارے واعظین منبروں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت و نجابت کے ثبوت کی خاطر جہاں اور بہت سی بے سروپا کہانیاں بیان کرتے ہیں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترم حضرت آمنہ نے اپنے بطنِ اطہر سے ولادت کے موقعہ پر غیر معتاد مناظر دیکھے اور ایسی بہت سی غیر معمولی باتیں واقعۂ ولادت کے ساتھ چسپاں کرتے ہیں۔ ایسی باتوں کی سند پر بحث کرنا فنِ حدیث کا وظیفہ ہے۔ عقلی طور پر اگر سوچا جائے تو مطلع صاف ہو جاتا ہے اور کوئی شک باقی نہیں رہتا کیونکہ اگر واقعی ایسے غیر معمولی مناظر رونما ہوئے تھے جیسا کہ یہ وعظ پیشہ حضرات بیان کرتے ہیں تو تاریخ ولادت میں اتنا اختلاف کیوں رونما ہوتا۔ آپؐ کی سیرت و تاریخ لکھنے والوں نے جہاں آپؐ کی پوری زندگی قلم بند کر دی اگر ولادت کے موقعہ پر کوئی غیر معمولی حادثہ ظہور پذیر ہوتا تو جہاں دوسرے واقعات مثلاً ہجرت غزوات فتوحات کی تاریخیں بلا اختلاف منضبط ہیں یہ تاریخ بھی بلا کسی اختلاف کے مذکور ہوتی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن معنوں میں نور ہیں جس معنی میں قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور کہا ہے وَالنُّورِ الَّذِي أَنزَلْنَا (تغابن) اس نور پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے اتارا ہے۔ اسی معنی میں ہم پیغمبر علیہ السلام کے نور کے قائل ہیں۔ اگر قرآن کریم کے نور سے زمین و آسمان روشن نہیں ہوتے اور نہ ہی قرآن کا نور شمس و قمر کے نور سے مشابہ ہے کہ اس قرآن کی موجودگی میں سورج اور چاند کی کوئی ضرورت نہ رہے تو اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور غیر جسمانی اور معنوی

ہے جس پر کبھی ظلمت غلبہ نہیں کر سکتی۔ نورِ نبوت کا تعلق زمین و آسمان سے نہیں جسم اور بدن سے نہیں اس کا تعلق قلب سے ہے، دماغ اور عقل سے ہے اخلاقِ فاضلہ اور صفاتِ حسنہ سے ہے۔ ایسا نور جو دنیا اور عقبیٰ دونوں جگہ روشنی کرے۔ ایسا نور جو کفر و شرک، بدعت و جہالت، تقلید و رسوم پرستی کے اندھیروں سے نکال کر شریعتِ بیضاء ملتِ غراء صراطِ مستقیم اور توحید و سنت کی شاہراہوں تک پہنچا دے۔ یہ سورج کا نور یہ چاند کی روشنی تو بڑھتی اور گھٹتی ہے پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہے موجود بھی ہو تو اس سے دنیا کا صرف ایک ہی حصہ روشن ہوتا ہے اور دوسرا ظلمت کدہ ہی رہتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی سے ایک عالم روشن ہے اور وہ بھی اس طرح کہ وہاں رات بھی دن کی طرح تابندہ ہے اس لیے آپؐ کے نور کو سورج اور چاند کے نور سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

مخالفینِ سنت سے ایک سوال

جب روزمرہ کے معاملات میں کہیں احادیثِ نبویہ میں اختلاف نظر آئے تو ہمارے اہلِ قرآن بجائے اس کے کہ اس میں کوئی درمیانی صورت نکال کر احادیث میں تطبیق و توفیق کی راہ اختیار کریں سرے سے حدیث ہی کا انکار کر دیتے ہیں کہ حدیث کوئی شے نہیں کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔ اب اگر یہی اصول تاریخ ولادت کی مختلف روایات پر چسپاں کیا جائے تو کیا ہمارے دوست فرمادیں گے کہ واقعۂ ولادت غلط ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک

اگر کوئی صاحب بصیرت مجسٹریٹ کسی واقعہ کی مختلف شہادتوں کو سن کر اصل واقعہ کے انکار کا فیصلہ نہیں دے سکتا، اگر کسی شہر کی آبادی میں مردم شماری کی رپورٹیں مختلف ہوں تو نفسِ آبادی کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مسئلہ میں مختلف روایات دیکھ کر ہم نفسِ حقیقت ہی کا انکار کر بیٹھیں۔ بہرحال روایاتِ ولادت کا اختلاف ہمارے مخالف دوستوں اور ہمارے نذر نیاز خوان اصحاب کے لیے غور طلب حقیقت ہے۔

میلاد کا شرعی مقام

شریعت کو کسی بڑے سے بڑے انسان کی موت و حیات سے اس طرح کی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ عبادت اور ثواب سمجھ کر اس طرح سالگرہ منائی جائے اور عید میلاد منعقد کی جائے۔ یا نوحہ و ماتم کر کے اظہارِ غم کیا جائے آخر اتنے انبیاء و اصفیاء عالم شہود میں آئے اور بے شمار نہایت بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔ اب اگر ہم ایک ایک کی عید میلاد منائیں یا ایک ایک کا ماتم کریں تو دن میں کئی بار تو میلاد کی محفلیں سجانا پڑیں اور کئی بار غم و اندوہ کا اہتمام کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی رسالت کا تئیس ۲۳ سال کا زمانہ اور خلافت کا تیس ۳۰ سال کا عرصہ ایک نگاہ سے دیکھ جائیں کہیں بھی آپ کو ایسی کوئی تقریب نظر نہیں آئے گی۔ نہ خود شارع علیہ السلام نے اپنی سالگرہ منائی اور

نہ اپنے اکابر واجداد کی کوئی عید میلاد منعقد کی اور نہ ہی صحابہ کرام نے ایسا کوئی ڈھونگ رچایا سوائے دو عیدوں کے وہاں کوئی تیسری عید نظر نہیں آتی۔ عید میلاد کا اہتمام تو کجا ان میں سے کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ بھی کوئی ثواب کا کام ہے حالانکہ ہم محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرام کی گرد راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

عید میلاد کو سب سے پہلے سلطان ابو سعید علی بن سبکتگین نے چھٹی صدی ہجری میں شروع کیا بعد میں جب مصر پر سنیوں کا غلبہ ہوا تو یہ لعنت ختم ہوئی پھر سلطان مظفر نے چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اس کو شروع کیا۔ سلطان مذکور بہت سادہ لوح اور جذباتی آدمی تھا۔ میلاد کی تقریب منانے کے لیے ماہ صفر میں تیاری شروع کر دیتا۔ ہر قسم کے قوال گانے بجانے اور غزل خوان واعظ اکٹھے ہو جاتے اور بے شمار قسم کے کھانے پکائے جاتے۔ پھر رفتہ رفتہ یہی فتنہ طول پکڑتا ہوا عید بن گیا۔ بعد ازاں جب زناکاری اور بد معاشی جیسے نتائج بد سامنے آئے تو سلطان کو یہ تقریب بند کر دینی پڑی۔

ہندوستان میں جہاں اور بہت سی بدعتیں فتوحاتِ اسلامیہ کے بعد آئیں محفلِ میلاد بھی اپنے تمام لوازم کے ساتھ سارے ملک میں چھا گئی۔ جاہل ملاؤں اور خود غرض سیدوں نے اس کی نزاکتِ شان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بدعت کو خوب ہوا دی۔ قرآنی آیات کی تحریف اور ترمیم کر کے احادیث کے کلمات کو غلط موقعہ پر محمول کرتے ہوئے اس کے جواز کی کوشش کی گئی۔ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر جذبات کو اس قدر اچھالا گیا کہ یہ رسم ایک میلہ اور ہنگامہ و تماشہ بن کر رہ گئی۔

محبت کا معیار

محبت کا معیار نعرہ بازی نہیں اور نہ عشق کا تقاضا ریا کاری اور دکھلاوا ہے۔ محبت زمانی اور مکانی نہیں ہوتی۔ الفت دائمی تعلق کا نام ہے جو عاشق کے دل پر اور اس کی زندگی پر ہمیشہ کے لیے غالب رہے۔ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نعرہ لگانا آسان ہے لیکن محب بننا مشکل۔ اگر محب بننا ہو تو صحابہ کرام مہاجرین عظام انصارِ مدینہ شہدائے احد مجاہدینِ بدر اور خصوصاً ان کی زندگی میں اسلام قبول کرنے والے فرشتہ سیرت لوگوں کی شیفتگی اور والہانہ عقیدت اور سراپا جاں نثاری سے سبق لینا ہوگا۔ محبت موسمی چیز نہیں کہ ربیع الاول میں تو سیلاب بن کر آئے اور باقی سارا سال آپ کو احساس تک نہ ہو کہ آپ کا کوئی رسول بھی ہے۔

محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آڑ میں لیڈروں کی سیاسی چالیں

جن لوگوں کو نماز روزہ سے کوئی واسطہ نہیں اور یہی نہیں بلکہ سارے اسلام سے بھی دور کا تعلق نہیں مگر اس کے باوجود جاہل عوام سے ووٹ کے خواہشمند ہیں تاکہ

سیاسی اقتدار حاصل کریں۔ ایسے حضرات اپنے اسلام کی نمائش کے لیے کبھی عید میلاد کا ڈھونگ رچا دیتے ہیں کبھی معراج کا نام لے کر کوئی ہنگامہ اور شور برپا کیا جاتا ہے حالانکہ ان مراسم کی حیثیت اسلام میں ریاکاری اور تماشہ سے زیادہ نہیں۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے دین کو کھیل اور تماشہ بنانے سے تعبیر کیا ہے ایسے اقدامات سے ان کا مطلب تو پورا ہو جاتا ہے مگر اسلام کو ان جلوسوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کاش یہی مال اور روپیہ جو ان فضول اور غیر ضروری کاموں پر خرچ ہو رہا ہے۔ غرباء مساکین پر خرچ ہوتا یا اس روپیہ سے سیرت کی کتابیں خرید کر مفت تقسیم کی جاتیں تاکہ عوام کا ذہن درست ہوا اور ان میں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت ہو یا اشاعتِ کتاب و سنّت کے دوسرے کاموں پر اس کو خرچ کیا جاتا تو بلاشبہ یہ ایک کام ہوتا۔ رہ گئی وہ قوم جو اپنے مقصدِ حیات کو فراموش کر بیٹھی ہے جو ساٹھ ہزار مساجد کو ویران چھوڑ کر یہاں اس لیے آئی ہے تاکہ میلاد کا جلوس نکال کر سیاسی اقتدار حاصل کرے تو ایسی قوم کا خدا ہی حافظ ہے اور پھر جس قوم کے لیڈر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر اپنی لیڈری چمکائیں اور جو زبان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بار بار لائیں مگر جب وہ وقت آئے تو قوم اور اس کے لیڈروں کی ہمدردیاں حسینؓ کے ساتھ نہ ہوں بلکہ یزید کے ساتھ ہوں تو ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

الاعتصام : ۶ر جنوری ۱۹۵۰ء

(فتاوے)

کیا فرماتے ہیں کہ علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اِن مسائل کے بارے میں

(۱) بعض علمائے دیوبند فرماتے ہیں کہ میرے درس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں صَدَقْتَ صَدَقْتَ اور مجھے کسی کے درس میں لطف نہیں آتا صرف تمہارے درس میں مزہ آتا ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم واقعی دنیا میں آتے ہیں اور درس سنتے ہیں؟

(۲) علمائے اہلِ حدیث میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری بیٹھک میں تشریف لائے اس وقت میں جاگتا تھا اور کتاب لکھ رہا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مولویوں کے گھر تشریف لاتے ہیں ؟

(۳) علمائے دیوبند راوی ہیں کہ بعض بزرگ مر گئے مگر مرنے کے بعد کھڑ کھڑ کر آئے اور ایک بزرگ بعد از مرگ بولے احمد علی، کیا یہ ممکن ہے ؟ مردہ بول سکتا ہے یا ہنس سکتا ہے ؟۔

(۴) درودِ تاج پڑھنا جائز ہے یا یہ شرک والا درود ہے ایک اہلِ حدیث مولوی صاحب نے بتایا کہ جائز ہے کوئی حرج نہیں۔ اس میں خاص باتیں یہ ہیں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم مانع بلا، وبا، الم، قحط ومرض ہیں۔ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ صفتیں خدا کی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھیں۔
(۵) آذر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ تھے یا چچا؟ ایک اہلِ حدیث مولوی صاحب چچا بیان کرتے ہیں۔ فقط۔ والسلام

الجواب وباللہ التوفیق

آپ کے سوالات کے متعلق کچھ عرض کرنا مشکل ہے اس لحاظ سے نہیں کہ سوالات میں کوئی خاص اشکال ہے صرف اس لیے کہ عوام میں اہلِ توحید وسنت کے متعلق مغالطہ پیدا کیا گیا ہے کہ یہ لوگ نہ تصوف سے آشنا ہیں نہ کرامات کے قائل ہیں۔ نہ اہلِ توحید میں کوئی ولی ہوا ہے اور بعینہٖ یہ خیال یہ لوگ حضرات اکابرِ دیوبند کے متعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب تعصب کی کار فرمائی ہے حقیقت ہو یا نہ ہو۔ ایک دوسرے پر طعن علماء کی بھی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس عادت سے شاید ہی علماء کا کوئی طبقہ محفوظ ہو اس کا لازمی اثر ہے کہ ایسے حضرات اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے مبالغہ آمیزی شروع ہو جاتی ہے۔ قرآن عزیز نے ایسے لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو دوسروں سے اپنی تعریف سننا پسند کریں یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا لیکن یہاں یہ حال ہے کہ اپنے ہی منہ سے اپنی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ عزیز نے صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کرو اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ کو خوب جانتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دیوبند کے اکابر میں یہ عادت نہ تھی۔ لیکن اب نئے حضرات اس میدان میں اتر رہے ہیں۔ وہ درس و تدریس کے ساتھ بیعت وارادت کا کام بھی کرتے ہیں اور یہ سارا کام کاروباری انداز سے ہوتا ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔ گویا اللہ تعالیٰ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی بھی ان حضرات کے کاروبار کا سرمایہ ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۱) جہاں تک آپ کے پہلے سوال کا تعلق ہے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ الاطہر اس دنیا میں تشریف نہیں لاتے نہ وہ ہر مقام پر حاضر و ناظر ہیں نہ ہی ان کو دنیوی زندگی حاصل ہے۔ برزخی زندگی کی شرعاً یہ نوعیت نہیں کہ اس دنیا سے قطع تعلق کے بعد پھر وہ اس دنیا میں آئیں اور ان حضرات کے مواعظ اور درس سنیں جن کے علم کی حیثیت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے سامنے پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علم نبوت کی وجہ سے ان نظری بلکہ وہمی علوم سے قطعی بے نیاز ہیں۔ پھر آں حضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ان دروس سے کیوں استفادہ فرمائیں ؟ پھر ان کی تصدیق فرمائیں اور تصدیق کی آواز بھی یہی حضرات حاضرین کے کان تک پہنچائیں۔ عجیب معاملہ ہے۔ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں واپسی کا ذرہ بھر بھی امکان ہوتا یا آپ فداہ روحی اس معاملہ میں کسی خدائی قانون کے پابند نہ ہوتے تو واقعہ حرّہ میں ضرور تشریف لاتے اور اس سانحہ کو روک لیتے، سقیفہ بنوساعدہ میں تشریف لاکر خلافت کا فیصلہ بذاتِ خود فرماتے، واقعہ کربلا کو ناممکن بنا دیتے۔ مختار ثقفی کا فتنہ قطعاً نمودار نہ ہو سکتا۔ حجاج بن یوسف کے مظالم کا کوئی امکان ہی نہ رہتا۔

اگر وعظ و نصیحت سننا ہی حضرت کا مقصود ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے خطبات ضرور سنتے۔ اور "صدقت" اور "مرحبا" کی سند عطا فرماتے۔ حضرات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کی فقہوں میں اختلافی مسائل میں بذاتِ خود فیصلہ فرما کر اختلافات ختم فرما دیتے۔ امام بخاریؒ اور دوسرے ائمہ حدیث کو حدیث کے صحت و سقم کے متعلق براہِ راست ہدایات فرماتے اور نتیجۃً نہ علم جرح و تعدیل کی ضرورت ہوتی نہ اصول حدیث اور اصولِ فقہ کے ان اسفار و دفاتر کی ضرورت باقی رہتی۔

حافظ ابن جوزیؒ، شیخ عبدالقادر حنبلیؒ، جنیدؒ، شبلیؒ اور دیگر اکابر ائمہ تصوف سے ملتے اور یہ حضرات اپنی تصانیف اور ملفوظات میں ان ملاقاتوں کا تذکرہ ضرور فرماتے مگر ان مقدس بزرگوں سے ایسی کوئی شئی منقول نہیں ؎

وائے بر ایں دعوئ اسلام و دیں   بود شبلی و نہ جنید ایں چنیں

ظاہر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح تشریف آوری کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں۔ ابن قیمؒ کی کتاب "الروح" اور حافظ سیوطیؒ کی شرح صدور، شیخ عبدالحق کی مدارج النبوۃ، مواہب لدنیہ وغیرہ میں بعض بزرگوں کے متعلق اس سے ملتی جلتی کہانیاں مرقوم ہیں۔ لیکن یہ قصے شرعی حجت نہیں۔ گذشتہ ایام میں جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات یا موت کی بحث احباب دیوبند میں چھڑی تھی تو مدعیانِ حیات کا انحصار حضراتِ دیوبند کی ایسی ہی بعض تجربات پر تھا۔ معلوم ہے کہ اس قدر اہم اعتقادی مسئلہ کے لیے یہ کہانیاں مفید نہیں ہو سکتیں۔ تصوف قدیم اور ائمہ سنت کے ارشادات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح کی زندگی کا قطعی پتہ نہیں چلتا اور نہ کسی وعظ میں آں حضرت تشریف لائے نہ درس سن کر "صدقت" کی سند عطا فرمائی۔

تصوفِ جدید میں دبس کا رواج اب دنیائے دیوبند میں عام ہو رہا ہے اور جا بجا بیعت کی دکانیں سجائی جا رہی ہیں، ایسی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ اگر کوئی مثالی یا کشفی صورت نظر بھی آ جائے تو ان میں اچھے

لوگ اسے عوام کے سامنے ذکر نہیں کرتے اور نہ ہی اس ریا و سمعہ سے اپنی مکان کو رونق دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چیزیں ظنی ہیں ان میں شیطانی وسوسوں کا کافی حد تک امکان ہے۔

(۲) اگر کسی نام کے اہلِ حدیث کو بھی اسی قسم کا جنون سمایا ہے تو اسے دماغی ہسپتال بھجوانے کی کوشش کیجیے تاکہ نہ خود برباد ہو اور نہ دوسروں کو تباہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس قسم کے قصے بعض خوابوں کی صورت میں بعض حضرات سے منقول ہیں لیکن خواب شرعی حجت نہیں البتہ یہ ممکن ضرور ہے کہ کوئی بزرگ خواب میں نظر آئے اور کوئی ہدایت یا نصیحت فرمائے مگر وہ خواب ہی ہوگا شرعی دلیل نہ ہوگا۔

(۳) قرآن اور سنت میں میری ناقص رائے کے مطابق کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ؓ ہمارے لیے اسوہ ہیں۔ مولانا احمد علی مرحوم کے متعلق ان کے ورثاء سے دریافت فرمالیں۔ وہ ہنسے تھے یا نہیں موت کے بعد کچھ فرمایا تھا یا نہیں۔ مرحوم کی قبر سے خوشبو پھیلنے کی بڑی شہرت تھی وہ بھی گپ ہی ثابت ہوئی۔ جب تک عرقِ گلاب اور عطر کا اثر قائم رہا جوان کے عقیدت مندوں نے قبر پر گرایا تھا خوشبو آتی رہی۔ وہ عشاق اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے تو خوشبو جاتی رہی۔ اب مرحوم کے کچھ بیوقوف مرید مرحوم کی قبر پر پھول ڈالتے ہیں اور قبر کے پاس تسبیحات پڑھتے ہیں۔ یہ جہالت ہے مولانا کے ورثاء کو چاہیے کہ اس بدعت کو بزور بند کریں۔ مولانا مرحوم کی ابتدائی زندگی بڑی مجاہدانہ تھی اُن کے مواعظ میں سادگی اور توحید نمایاں تھی جوں جوں مرحوم حد باید تصوف میں پھنسنے گئے وہ رنگ جاتا رہا۔ بریلوی پیروں کی طرح عام دست بوسی اور رسمی آداب مرحوم پر غالب آگئے۔ نہ پہلا زہد رہا نہ ہر وعظ میں توحید کا رنگ غالب رہا تاہم مرحوم کا وجود غنیمت تھا۔ آج کے حضرات دیوبند تو رد زبیر و زبریلوی حضرات کے قریب تر ہو رہے ہیں۔ البتہ مولانا حسین علیؒ کے تلامذہ اس سے کافی حد تک محفوظ ہیں مگر تصوف مستحدث ان میں بھی راسخ ہو رہا ہے۔ ہمارے سادہ لوح اہل حدیث حضرات کو دیوبند کے موحد اور متنسب حضرات میں امتیاز کرنا چاہیے۔ اب ان میں اکثر حضرات رسمی پیری مریدی بطور کاروبار کر کے بریلوی حضرات کی طرح خانقاہی نظام کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اہلِ حدیث علماء سے لوگوں کو متنفر کریں۔ جب بریلوی اور اہلِ حدیث اختلافات کا تذکرہ آئے تو یہ عموماً شرک پسند حضرات کو اہلِ توحید پر ترجیح دیتے ہیں۔ اہلِ کتاب کی طرح ﴿هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا﴾ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے ہیں اور شرک پسند حضرات کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سادہ لوح اہلِ حدیث حضرات چونکہ اس نئی پالیسی سے بے خبر ہیں اور وہ پرانے تصورات کے مطابق ان حضرات کی ان کہانیوں اور تزکیہ و توحید کے دعووں سے غلطی کھا کر ان دعاوی کو صحیح سمجھنے لگتے ہیں۔ بایں ہمہ چند

افراد اب بھی احباب دیوبند میں ایسے موجود ہیں جن کے دل میں توحید کے لیے ایک سوز اور تڑپ پائی جاتی ہے ان کا انداز بھی کاروباری نہیں۔ مجھے احباب دیوبند سے حسن ظن ہے ان میں دین کی خدمت اور توحید کا جذبہ کہیں کہیں پایا جاتا ہے مگر یہ نئی پالیسی جو جدید دیوبند میں فروغ پا رہی ہے اس سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ بزرگوں کے متعلق یہ قصے اور کہانیاں جن کا سائل نے ذکر کیا ہے اسی جدید پالیسی کا نتیجہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تصوف جدید کے بہت بڑے ماہر اور ترجمان ہیں۔ ان کے ابنا کرام اور تلامذہ پر بھی یہ ذوق غالب ہے اس کے باوجود وہ تصوفِ جدید کے رسوم سے متنفر اور خائف ہیں۔ اپنے وصیت نامہ میں وصیت نمبر ۳ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

"۔۔۔۔ نسبتہائے صوفیہ غنیمتِ کبریٰ است و رسومِ ایشاں ہیچ نمے ارزد و ایں سخن گراں خواہد بود اما مرا کارے فرمودہ اند بر حسبِ آں مے باید گفت و بر گفتہ زید و عمرو تعریج نمے باید کرد۔

صفحہ ۱۱۶ ملحقہ عقد الجید۔

ترجمہ:۔ صوفیا کی نسبتیں غنیمتِ کبریٰ ہیں لیکن ان کی راز قسمِ ایجادِ بندہ) رسم و رواج کی کوئی قیمت نہیں۔ میری یہ تصریح گراں ضرور گذرے گی مگر جس کام پر مقرر ہوں اس کے مطابق گفتگو کرنا لازم ہے۔ زید و عمرو کی بات کا کچھ اعتبار نہیں۔

اسی وصیت نمبر ۳ کے شروع میں فرماتے ہیں۔

وصیت دیگر آں ست کہ دست در دست مشائخ ایں زماں کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد و لغلو عام مغرور نباید بود و نہ بکرامات زیرا کہ اکثر غلو عام سبب رسم است و امورِ رسمیہ را بحقیقت اعتبارے نیست و کرامات فروشان ایں زماں ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات وانستہ اند۔

صفحہ ۱۱۴

اس زمانہ کے مشائخ کی بیعت نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی بدعات سے ملوث ہیں۔ اور ان کے عام غلو سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ نہ ان کی کرامات پر توجہ دینی چاہیے۔ یہ غلو رسوم کا نتیجہ ہے اور رسمی چیزوں کی بمقابلہ حقیقت کوئی قیمت نہیں۔ اس زمانے کے کرامت فروش طلسمات اور شعبدہ بازیوں کو کرامت سمجھتے ہیں۔

آپ نے تینوں سوالات میں جن بعض دیوبندی اور اہلِ حدیث حضرات کا ذکر فرمایا ہے وہی حضرات جن کو شاہ صاحب نے کرامت فروشی کا خطاب دیا ہے۔ اعاذنا اللہ منہم۔

(۴) مسنون اور ماثور درود کے ہوتے ہوئے اس قسم کے مصنوعی درود کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ درود تاج میں مشرکانہ الفاظ کے علاوہ اس کی عبارت زبان کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔ حافظ ابن القیمؒ نے جلاء الافہام اور حافظ سخاوی نے القول البدیع اور نواب صدیق حسن خاںؒ نے نزل الابرار میں درود شریف کے متعدد صیغے درج فرمائے ہیں اور ان کی اسانید پر بحث فرمائی ہے۔ جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں انہیں پڑھنا چاہیے بعض بزرگوں نے درود تاج کی بڑی اہمیت بیان کی ہے اور اس کے لیے اجازت بھی دی ہے لیکن کوئی شرعی دلیل ذکر نہیں فرمائی اس لیے مشکوک مشتبہ وظائف سے پرہیز بہتر ہے۔

(۵) قرآن عزیز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آذر ذکر فرمایا ہے بعض لوگ انہیں چچا کہتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ چچا کو بھی باپ کہا جاتا ہے لیکن اس کے لیے قرینہ ہونا چاہیے ورنہ 'اب' کا حقیقی معنی باپ ہی ہوتا ہے۔ عہد نامۂ قدیم تورات تواریخ ۱ باب ۱ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ لکھا ہے اور لوقا باب ۳ میں ان کا نام ترہ مرقوم ہے۔ اگر عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید کے بیانات کو کچھ اہمیت دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا نام آذر تھا اور تارخ اور ترہ ان کے لقب ہوں گے۔ بہرکیف قرآن عزیز کے بیان کو ترجیح ہے۔ صحیح یہی ہے کہ ان کا نام آذر تھا اس معاملہ میں زیادہ مغالطہ آمیزی شیعہ حضرات کی جانب سے کی جاتی ہے اس لیے کہ وہ آذر کے کفر سے گھبراتے ہیں جس کی قرآن عزیز نے صراحت فرمائی ہے۔ اہل سنت کے نزدیک باپ بیٹے کے خیالات میں اختلاف[1] کوئی بات نہیں اللہ تعالیٰ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی۔

الاعتصام: ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۶۸ء

حرمت مصاہرت

۱۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں:

مثلاً زید نے اپنی زوجہ کی حقیقی خالہ سے ناجائز خیال سے دست درازی کی لیکن صحبت نہیں کر سکا اور زید اپنی بیوی کو ابھی تک گھر نہیں لایا صرف نکاح کیا ہے اب وہاں کے حنفی علماء کہتے ہیں کہ زید پر اس کی بیوی حرام ہو گئی۔ حرمتِ مصاہرت کے طور پر۔ . . . جناب سے التماس ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کیا زید اپنی بیوی کو گھر لا کر آباد کر سکتا ہے؟

---

[1] یعنی اگر بیٹا مسلمان ہے تو باپ کافر ہو سکتا ہے و کذا بالعکس جیسے حضرت نوحؑ اور ان کا بیٹا۔ م۔ ا

الجواب

جمہور علمائے محدثین کے نزدیک حرمتِ مصاہرت سے حلال چیز حرام نہیں ہو سکتی۔ حدیث شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یُفْسِدُ الْحَلَالُ بِالْحَرَامِ (دار قطنی ص۴۰۲ ج۲)

حرام کی وجہ سے حلال فاسد نہیں ہوگا۔

اس حدیث کی سند ضعیف ہے عثمان بن عبدالرحمان وقاضی متروک ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔ لَا یُحَرِّمُ الْحَرَامُ الْحَلَالَ (دار قطنی ص۴۰۲ ج۲)

ابنِ ماجہ تعلیق المغنی میں ہے اسنادہ اصلح منہ۔ اس کی سند حضرت عائشہؓ کی روایت سے بہتر ہے

بخاریؒ نے اسے تعلیقاً حضرت ابنِ عباسؓ سے ذکر فرمایا ہے۔ سہیل نے بواسطہ عکرمہ اسے موصولاً ذکر فرمایا ہے:۔

رَجُلٌ غَشِیَ اُمَّ امْرَأَتِهٖ قَالَ تَخَطّٰی حُرْمَتَیْنِ وَلَا یُحَرِّمُ عَلَیْهِ امْرَأَتُهٗ وَاِسْنَادُهٗ صَحِیْحٌ

(تعلیق المغنی ص۴۰۲ ج۲)

اس نے دو حرام کام کیے۔ زنا کی حرمت اور بیوی کی ماں کی حرمت مگر اس کی بیوی اس پر حرام نہیں۔ سعد بن حبیب، زہری وغیرہ ائمہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

احناف کے نزدیک حرمتِ مصاہرت کا مسئلہ ان احادیث کے خلاف ہونے کے علاوہ بڑا ہی غیر فقہی معلوم ہوتا ہے۔ مصاہرت کا تعلق شرعاً حلال اور جائز نکاح کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ زنا کی صورت میں مصاہرت نہیں ہوگی۔ خالہ کے ساتھ اگر نکاح کیا جاتا تو شرعاً نادرست ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لَا تُنْکَحُ الْمَرْأَةُ عَلٰی خَالَتِهَا۔ خالہ اور بھانجی کو نکاح میں جمع نہ کیا جائے۔

زنا کے احکام تو شرعاً حد کی صورت میں ہیں اور پھر اس صورت میں زانی نے عیاشی کی اور سزا بے چاری معصومہ کو ملی۔ اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔ اگر یہ زانی حد سے بچ جائے تو احناف بھی اجازت دیتے ہیں کہ وہ زانی موطوءہ سے نکاح کرے۔ زانی تو مزے میں رہا۔ ایک گئی دوسری آگئی۔ اس لیے اسے حرمتِ مصاہرت قرار دینا ایسی چیز ہے جس پر فقہائے حنفیہ کو نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ مصاہرت تو صحیح شرعی نکاح سے ہوگی۔ زانی کے لیے حرام اور ناجائز راہ سے حلال نکاح کی راہ کھل گئی اس نے زانیہ سے نکاح کر لیا۔ سزا تو اسے ملی جس نے کوئی غلطی نہیں کی لیکن اسے فقہائے حنفیہ کے حکم سے نئے خاوند کی تلاش

میں نکلنا پڑا۔

زنا کو اگر مصاہرت کا حکم دیا جائے تو زانیہ کو مہر ملنا چاہیے اس پر عدت ہونی چاہیے اسے زانی کی میراث ملنی چاہیے۔ یہ بے چاری تو فوائد سے محروم ہو گئی اور بلا گناہ اسے سزا ملی۔ فقہاءِ حنفیہ رحمہم اللہ کا یہ فیصلہ درایت کے بالکل خلاف ہے اور صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس حرام کا اثر حلال پر نہیں ہوگا۔

فقہاءِ حنفیہ رحمہم اللہ کا فیصلہ تحلیل بالحلالہ بھی اسی طرح درایت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو قرآن عزیز کا فیصلہ ہے:۔

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ

وہ کسی دوسرے خاوند کے ساتھ صحیح شرعی نکاح کرے پھر وہ اپنی مرضی سے طلاق دے یا اس کی وفات ہو جائے۔ تو یہ پہلے خاوند سے نکاح کر سکے گی۔ نہایت ہی معقول اور صحیح فیصلہ ہے لیکن فقہاءِ حنفیہ فرماتے ہیں گو حلالہ نادرست ہے۔ لعن اللّٰہ المحلل والمحلل لہ۔ لعنت ہے حلالہ کرنے کرانے والے پر۔ اگر حلالہ کر لیا جائے تو عورت اس وقت پہلے خاوند پر حلال ہو جائے گی۔ اور اس سے نکاح کر سکے گی۔ تین طلاق دینے میں خاوند نے غلطی کی لیکن سزا عورت کو ملی۔ وہ کچھ عرصہ کے لیے دوسرا شوہر تلاش کرے پھر حلالہ حرام اور نادرست ہونے کے باوجود جائز نکاح کا ذریعہ بن گیا۔ پہلی صورت میں زنا نے حلال بیوی کو حرام کر دیا۔ دوسری صورتِ حلالہ میں مطلقہ ثلاثہ کے حرام نکاح کو حلال کر دیا۔ دونوں فیصلے فقہ کے ہیں اور دونوں درایت کے خلاف ہیں۔ صریح اور صحیح احادیث کے بھی موافق نہیں۔

محمد اسماعیل کان اللہ لہٗ

گوجرانوالہ۔ ۱۷ فروری ۱۹۶۸ء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین۔

۱۔ ایک رشتہ دار مشرک بدعتی جاہل کی شادی ہوتی ہے جس میں بہت سی بدعات پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً گانے بجانے۔ قوالیاں۔ مولود وغیرہ بلکہ بہت سی ان کے علاوہ اور بدعتیں ہوتی ہیں اور کھانے کے بعد دولہا کو لا کر دعوت والے لوگوں سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ اب ایسی شادی کی اگر کوئی مسلمان موحد بوجہ ان بدعتوں کے دعوت قبول نہیں کرتا تو اسے رشتہ سے خارج کر کے اور اس سے

لیں دین ختم کر دیتے ہیں۔ ہمارے لیے ایسی شادی کی دعوت قبول کرنا اور کھانا کھانا کیسا ہے؟

۲۔ قرآن مجید کا شعر و نظم میں ترجمہ کرنا درست ہے؟

۳۔ کیا بغیر وضو کے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر پڑھنا درست ہے؟

۴۔ عشاء کی وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

۵۔ زکوٰۃ یا فطرانہ مسجد کے کام میں دینے کا کیا حکم ہے؟

۶۔ ایک مولوی صاحب جمعہ کا طویل خطبہ دیتا ہے یہاں تک کہ قد سے سایہ بڑھ جاتا ہے یعنی ظہر کا وقت بھی فوت ہو جاتا ہے لیکن مولوی صاحب خطبہ بند نہیں کرتا۔ آخر موذن اقامت کہتا ہے تو مولوی صاحب بعد نماز موذن کو کہتا ہے کہ تم نے شریعت میں بڑا جرم کیا ہے کہ میری تبلیغ بند کی ہے، اور اب میری مرضی ہے جب خطبہ بند کر دوں۔ تم نے کیوں اقامت کہی۔ براہ کرم قرآن و حدیث کی رو سے جواب دے کر بذریعہ الاعتصام آگاہ فرمائیں۔ شکریہ

الجواب و باللہ التوفیق

۱۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ (مشکوٰۃ) دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور بدعت گمراہی کا راستہ ہے۔ لا یقبل اللہ لصاحب بدعۃ صرفا ولا عدلا۔ بدعتی کے فرض اور نوافل قابل قبول نہیں۔ ایسی شادیوں میں شریک نہیں ہونا چاہیے بلکہ ایمانی غیرت کا ثبوت دینا چاہیے اور جہلاء کی تلخیوں سے نہیں گھبرانا چاہیے۔

۲۔ اشعار میں ترجمہ صحیح طور پر نہیں ہوتا اور اس طرح مفہوم غلط ہو جانے کا امکان ہوتا ہے البتہ ترجمانی کے طور پر ایسے اشعار جن میں قرآن کا مطلب پوری طرح بیان ہو گیا ہو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

۳۔ قرآن مجید با وضو پڑھنا افضل ہے بغیر وضو بھی پڑھا جا سکتا ہے البتہ جنابت ہو تو مس درست نہیں۔

۴۔ نوافل پڑھتے وقت بیٹھنے کا ذکر بعض احادیث میں آیا ہے مگر یہ اختیاری ہے کھڑے ہو کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ نوافل نہ پڑھے تو بھی درست ہے۔

۵۔ زکوٰۃ اور صدقہ فطر مساکین اور فقراء کا حق ہے مساجد پر صرف کرنا درست نہیں۔

۶۔ اتنا لمبا خطبہ بے وقوفی کی علامت ہے اگر نماز کا وقت نکل رہا ہو تو خطبہ دینا گناہ ہے ایسے خطیب کو پکڑ کر منبر سے اتار دینا چاہیے۔

محمد اسماعیل گوجرانوالہ

۱۱ ؍ فروری ۶۸ء

فقہ حدیث

عدت کے دوران نکاح

زید کی بیوی ناراض ہو کر میکے چلی گئی، زید نے اسے دو طلاقیں دے دیں۔ تین ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے اب زید اپنی بیوی کو واپس لانا چاہتا ہے، کیا پہلا نکاح کافی ہے یا نکاحِ ثانی کی ضرورت ہے ؟

الجواب

اگر تین حیض پورے ہو چکے ہیں تو رجوع تجدیدِ نکاح سے ہوگا۔ اور اگر تین حیض پورے نہ ہوئے ہوں تو سابق نکاح کفایت کرے گا۔ تجدید کی ضرورت نہیں۔ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔

زانی اور زانیہ کا نکاح

ایک لڑکی کا ناجائز تعلق زید کے ساتھ ہو گیا۔ زید سے اسے حمل رہ گیا۔ لڑکی کے والدین نے اس کا نکاح بکر کے ساتھ کر دیا۔ لڑکی بچہ پیدا ہونے کے بعد پھر حاملہ ہو گئی۔

(۱) کیا یہ نکاح جائز ہے ؟

(۲) اگر جائز نہیں ہے، تو کیا اب بحالتِ موجودہ نکاح ہو سکتا ہے ؟

الجواب

حاملہ کا نکاح صورتِ مستفسرہ میں احناف کے نزدیک زید اور بکر دونوں سے درست ہے لیکن بکر کو ایامِ حمل میں مقاربت کی اجازت نہیں۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ ایسے نکاح درست نہیں۔ قرآنِ عزیز نے دونوں کے لیے شرط لگائی ہے۔ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ اور اسی طرح عورت کے متعلق فرمایا۔ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (سورہ نساء پ ۵) نکاح کے وقت عورت اور مرد دونوں کو پاکباز ہونا چاہیے۔

یہ کلمات مقامِ نکاح میں بمنزلہ شرط ہیں، اس لیے جب تک عورت کی پاکیزگی کا نکاح کے وقت تعین نہ ہو، یہ شرطِ نابید ہو گی۔ بدکار عورت بھی اگر نکاح کرے تو اسے اتنا وقفہ ملنا چاہیے جس میں عورت کی سچی توبہ

کا یقین ہو جائے۔ قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے زانی اور زانیہ کے طبعی رجحانات کا ذکر فرما کر آخر میں فرمایا:
وَحُرِّمَ ذَٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ۔ اہلِ ایمان کے لیے ایسے نکاح نادرست ہیں اور حرام ہیں۔

سنن ابوداؤد میں ابومرثد غنویؓ سے مروی ہے کہ اسلام سے پہلے ان کا تعلق ایک بدکار عورت سے تھا جس کا نام عناق تھا۔ فرماتے ہیں۔

جِئْتُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ أَنْكِحُ عَنَاقًا؟ قَالَ فَسَكَتَ عَنِّي فَنَزَلَتِ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ فَدَعَانِي فَقَرَأَهَا عَلَيَّ وَقَالَ لَا تَنْكِحْهَا ۱۲ (جلد ۱ ص۲۸۰ مطبع مجتبائی)

میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا میں عناق سے نکاح کر لوں آپ خاموش رہے پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ اَلزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ الخ آپ نے یہ آیت سنا کر فرمایا کہ اس سے نکاح مت کرو۔

دوسری روایت حضرت بصرہ انصاری سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں۔

إِنَّهُ نَكَحَ امْرَأَةً فَوَجَدَهَا حُبْلَى وَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا (جلد ۱ ص۱۹۷)

بصرہ نے ایک عورت سے نکاح کیا اسے ناجائز حمل تھا۔ آپؐ نے ان دونوں میں تفریق کرا دی۔

اس سے ظاہر ہے کہ شرعاً ایسے نکاح درست نہیں ہیں۔ نکاح ایک مقدس تعلق ہے جس کا مقصد عصمت اور پاکیزگی پیدا کرنا ہے اگر اس گندگی میں بھی نکاح کی اجازت دی جائے تو نکاح کی تقدیس اور نسب کی صحت مخدوش ہو جائے گی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے سورۂ نور اور فتاویٰ میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس نکاح کے ناجائز ہونے کی صراحت فرمائی ہے۔

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ
(الاعتصام: یکم فروری ۱۹۵۲ء)

حقہ نوشی

حقہ نوشی کے متعلق قرآن و حدیث کی رو سے صحیح صحیح فتویٰ عنایت کریں کہ شریعت میں اس کا کیا حکم ہے، گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ، قطعی حرام ہے یا نہیں۔ اگر حرام ہے تو کس حدیث کی رو سے؟

الجواب

حقہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھا، اس لیے محرمات منصوصہ کی طرح اس کا

تذکرہ زبانِ رسالت مآب سے مشکل ہے لیکن ایک چیز ظاہر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیاز وغیرہ بدبودار چیزیں استعمال کر کے مسجد میں نہ آؤ اس سے ملائکہ کو اذیت ہوتی ہے۔ تمباکو کی بو پیاز وغیرہ سے زیادہ مکروہ ہے اس لیے حقہ نوش کی مسجد میں حاضری اور نماز باجماعت اس حدیث کی رو سے ناپسندیدہ ہو گئی، سنا ہے کہ حقہ کی بدبو منہ سے نہیں جا سکتی نیز عادۃً پینے والے اتنا وقفہ بھی نہیں کر سکتے جس سے بدبو دور ہو جائے۔ لہٰذا سائل کو حقہ اور نماز میں سے ایک چیز کو ترجیح دینی ہو گی۔

اس کے بارے میں علماءِ امت کے دو مسلک ہیں بعض اسے مباح کہتے ہیں اور بعض حرام۔ مباح کہنے والوں کا خیال ہے کہ اس کی حرمت کے متعلق کوئی صریح نص نہیں، مخالفین کا خیال ہے کہ اصول کے طور پر اس کی حرمت کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے۔

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ نَهَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ وَمُفَتِّرٍ (ابوداؤد جلد ۳ صفحہ ۴۷)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مست کرنے والی اور فتور پیدا کرنے والی چیز سے منع فرمایا ہے۔

اس اصل کی بنا پر علماء کا خیال ہے اور تجربہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمباکو حقہ میں استعمال کرنے سے فتور آ جاتا ہے، سائل کی بے قراری، بار بار چھوڑنا اور پھر شروع کرنا اس کی دلیل ہے، فتور ہی کے لیے یہ اضطراب ہوتا ہے، تاہم یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ میرا ذاتی رجحان حرمت کی طرف ہے مگر فتویٰ کے طور پر ایسا کہنا مشکل ہے۔ اس کی مضرت اور برائی کا اقرار تو شاید اس کے تمام پینے والے بھی کرتے ہیں اس لیے جو چیز متفقہ طور پر بری ہو اسے چھوڑ ہی دینا بہتر ہے۔ بنابریں آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ ہمیشہ کے لیے حقہ چھوڑ دیں۔

حدیث ام سلمہؓ ـــــ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ـــــ میں شہر بن حوشب میں کلام ہے، امام مسلم نے ان پر گفتگو فرمائی ہے، امام احمد اور یحییٰ بن معین اور امام بخاری نے ان کی توثیق فرمائی ہے۔ ترمذی ان کی حدیث کو صحیح فرماتے ہیں، تضعیف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حدیث حسن سے کم نہیں اس لیے قابلِ عمل ہے اور حقہ نوشوں کے لیے مقامِ غور۔

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

(الاعتصام: ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء)

عُشر کی ادائیگی بہر صُورت ضروری ہے

۱۔ پاکستان میں غیر مسلموں کی متروکہ زمین جس پر حکومتِ پاکستان نے مہاجرین کو آباد کیا ہے، کی پیداوار پر عشر ہے یا نہیں؟ جب کہ ہم مہاجرین تین گنا معاملہ ادا کرتے ہیں۔ زمین نہری ہو یا چاہی اور خراجی زمین کے متعلق بھی وضاحت فرمادیں کہ پاکستانی زمین خراجی ہے یا نہیں؟

۲۔ ہمارے چک نمبر ۸ میں جماعت نے اپنا بیت المال قائم کیا ہوا ہے کیا اس میں جو اجناس یا روپیہ جمع ہو وہ آئندہ سال تک ختم ہوجانا چاہیے یا بچ بھی رہے تو کوئی حرج نہیں؟

۳۔ اگر بیت المال میں سے کسی ایسے شخص کو اناج یا روپیہ بطورِ قرضِ حسنہ دیا جائے تو جائز ہے یا نہیں جو کہ ایسا غریب نہیں ہے کہ صدقہ کا مستحق ہو اور وقتی ضرورت بھی ہے۔ پھر وہ قرض ادا بھی کرسکتا ہے ——— ان سوالات کے جوابات قرآن وحدیث کے دلائل سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیں تاکہ ہماری جماعت کا اختلاف دور ہو۔

الجواب

متذکرہ بالا سوالات کے متعلق کوئی صریح حدیث میری نظر میں نہیں ہے۔ میں اپنا فہم عرض کر رہا ہوں، اس لیے آپ کو اس پہ قانع ہونے کی ضرورت نہیں، بہتر ہے کہ تسکین کے لیے علماء کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

۱۔ پاکستان میں بعض زمینوں کی ملکیت متنازع فیہ ہے، جب تک دونوں حکومتیں فیصلہ نہ کریں یہاں کی زمین کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ الاٹمنٹوں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج مستقل ملکیت کی طرف رجحان ہو رہا ہے، معاملہ کی شرح میں اس قدر اضافہ یقیناً ظالمانہ فعل ہے جس پر حکومت کو نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود صحیح مسلک کے مطابق ان پر عشر واجب ہو گا۔ حکومت لاعلمی کی وجہ سے معاملہ تو خراج کی طرح وصول کر رہی ہے جو اسے انگریز کی وراثت میں ملا ہے۔ حالانکہ زمین کی نوعیت پر سب سے پہلے غور کرنا چاہیے تھا۔ چونکہ معاملہ زمین کی رقم کے مصارف اور عشر و زکوٰۃ کے مصارف الگ الگ ہیں اس لیے معاملے کی اس کثرت کے باوجود عشر اور زکوٰۃ کی فرضیت برقرار رہے گی۔

۲۔ بیت المال میں زکوٰۃ آجانے کے بعد اسے اس سال میں ختم کرنا ضروری نہیں بلکہ حسبِ ضرورت ختم کرنا چاہیے۔ بیت المال کے مصارف کی نوعیت کا تعین حکومت کا فرض ہے یا ان لوگوں کا جو

بیت المال کا انتظام کریں۔

۳۔ زکوٰۃ کے مصارف قرآن میں متعین اور معلوم ہیں ان میں صرف کرنا ضروری ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ الآیۃ۔ قرض دینے کے متعلق کوئی نص نظر میں نہیں لیکن اگر اس عمل سے فقراء اور مساکین کے حقوق کو نقصان نہ پہنچے تو کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ فقراء اور مساکین کی ضرورت کو بر وقت پورا ہونا چاہیے۔

محمد اسماعیل گوجرانوالہ

الاعتصام: ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۱ء

میّت کے لیے دُعا کی شرعی حیثیت

۱۔ مرنے ..... والے کے لیے کیسے دُعائے مغفرت کی جائے اور اس کے لواحقین کو اس کے مرنے کے بعد سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت کیا کچھ کرنا چاہیے۔ نیز یہ جو عام طور پر تیسرا، دسواں اور چالیسواں وغیرہ دنیا کرتی ہے کیا یہ جائز ہے؟ اگر نہیں تو اسے کیوں رائج کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ آخری چہار شنبہ کی جو تعطیل منائی جاتی ہے تو یہ دن کیوں منایا جاتا ہے۔ اس روز مسلمان کو کیا کرنا چاہیے کیا یہ بھی ویسے ہی رسم و رواج ہے۔

الجواب

۱۔ موت کے بعد میت کے لیے دعا اور صدقہ یقیناً مفید ہیں۔ جنازہ خود میّت کے لیے دُعا ہے۔ لیکن صدقہ اور دعا کے لیے کسی خاص وقت کا تعین شرعاً ثابت نہیں، موت کے بعد میت کے گھر بیٹھ کر عموماً دعاؤں کا تانتا باندھ دیا جاتا ہے، ہر آنے والا دُعا کے لیے اس انداز سے درخواست کرتا ہے گویا وہ اپنی حاضری نوٹ کرا رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں دعا ختم ہوتی ہے اور حقہ اور گپوں کا دور شروع ہو جاتا ہے اور دُعا کے وقت بھی دِل حاضر نہیں ہوتا حالانکہ دِل کی توجہ دُعا کے لیے ازبس ضروری ہے۔ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْ قَلْبٍ لَاهٍ اللہ غافل دل کی دعا منظور نہیں فرماتا۔

میّت کے لیے دعا ہر وقت بلا تخصیص کی جا سکتی ہے اور زندوں کی طرف سے یہی بہترین صلہ ہے جو میت کو دیا جاتا ہے بشرطیکہ سنّت کے مطابق ہو تعزیت کا مطلب گھر والوں کی تسکین ہے، دعا اگر مجلس کے بجائے انفراداً کی جائے تو دعا کا مقصد بہتر طور پر پورا ہو سکتا ہے، غرض یہ تین دن کا جلسہ دعائیہ سنت میں ثابت نہیں۔ ان مجالس میں حقہ اور بھی ان کے مقصد کو برباد کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کا ثواب

ہدیۂ میت کو دینا اس میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ اسے مفید سمجھتے ہیں۔ میری نظر میں اس کی کوئی دلیل نہیں اگر یہ امر مستحسن ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بیسیوں قرآن کا ثواب ہدیہ کرتے لیکن سنت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ بھی قرآن پڑھنا ثابت نہیں۔

تیسرا، دسواں، چالیسواں یہ تمام امور بدعتِ سیئہ ہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ اسلام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے اس کے متعلق ایک حرف بھی ثابت نہیں۔ احناف میں اس کا رواج حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اسمِ گرامی پر ایک تہمت ہے۔

۲۔ آخری چہار شنبہ کوئی اسلامی تہوار نہیں۔ یہ محض جہلا کی ایک رسم ہے مسلمانوں کی کوئی تاریخی یادگار اس سے وابستہ نہیں۔

محمد اسماعیل گوجرانوالہ

الاعتصام: ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء

کیا مردہ کے کفن پر کلمہ یا عہدنامہ وغیرہ لکھنا درست ہے

ہمارے علاقہ میں رواج ہے کہ مردہ کے کفن پر کلمہ شریف اور عہدنامہ وغیرہ لکھتے ہیں اور یوں بیان کرتے ہیں کہ جب مردہ سے قبر میں سوالات ہوتے ہیں تو مردہ اپنے کفن سے دیکھ کر کلمہ شریف پڑھ دیتا ہے تب فرشتے بول اٹھتے ہیں کہ بس ہمارے سوالوں کا جواب ہو گیا اور پھر اسی وقت اس کی قبر میں جنت کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے۔

اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اس عقیدہ کا ثبوت مطابق مسلک اہل سنت والجماعت ملتا ہے یا نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آں حضرت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیراہنِ مبارک پر کلمہ شریف یا عہد نامہ لکھا گیا ہے یا نہیں۔ اگر لکھا گیا ہے تو کس نے لکھا اگر نہیں تو کیوں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی شدہ صاحبزادیوں میں سے کسی صاحبزادی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انتقال ہوا ہے یا نہیں اگر ہوا ہے تو ان کے پیراہنِ مبارک پر حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کلمہ شریف یا عہد نامہ لکھا ہے یا کسی صحابی کو لکھنے کا حکم فرمایا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی صاحبزادیوں کے پیراہن کفن پر کلمہ شریف یا عہد نامہ لکھا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چاروں خلفاء راشدین بالترتیب خلیفہ ہوئے اور دارالبقاء کی طرف رحلت فرما گئے۔ آیا ان کے پیراہن کفن پر کلمہ شریف یا عہد نامہ وغیرہ لکھا گیا ہے یا نہیں۔ اگر لکھا گیا ہے تو کس نے لکھا۔ اگر نہیں تو کیوں؟

ان سوالات کا جواب قرآن مجید اور صحیح حدیث کی روشنی میں دیا جائے۔ والسلام۔

الجواب وباللہ التوفیق

کفن پر کلمہ توحید یا کوئی عہد نامہ لکھنا شرعاً ثابت نہیں۔ نہ اس کا ذکر قرآن میں ہے نہ سنت میں اللہ تعالیٰ کا مخلوق سے ایک عہد ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا۔ جنت کی نعمتیں ان لوگوں کو عطا کی جائیں گی جن کے پاس ایمان اور عمل صالح کا سرمایہ موجود ہوگا، اعتقاد کی صحت اور عملی زندگی کی صلاحیت یہ یقین اور عمل کی چیز ہے، لکھنے سے یہ چیز پیدا نہیں ہوتی، بے عمل قومیں حیلے بہانے کر کے اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اور یہ اللہ اور اس کے قانون کے ساتھ دھوکہ ہے جو مومن کے لیے مناسب نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ دھوکہ میں آسکتا ہے۔ یہ چیز کم علم علماء کی پیدا کی ہوئی ہے اور اس کی شرعاً کوئی دلیل نہیں۔ پھر یہ حیلہ جاہل کو کیا فائدہ دے گا جو پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اگر لکھے پڑھے کافر کے کفن پر یہ عہد نامہ یا کلمہ لکھا تو کیا اسے فائدہ دے گا؟ یقیناً نہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن مبارک پر ایک حرف نہیں لکھا گیا اور وہاں ضرورت کیا تھی کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلمہ بھی یاد نہ تھا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکیوں میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فوت ہوئیں ان کے پیراہن یا کفن پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ حضرت خدیجہؓ کا انتقال آپؐ کے ہاتھوں میں ہوا۔ ان کے کفن پر بھی کچھ نہیں لکھا گیا۔

آں حضرت کے چاروں خلفاء بلکہ ہزاروں صحابہ جو آپ کی زندگی میں فوت ہوئے یا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن کا انتقال ہوا کسی کے کفن پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ ایمان اور نیک اعمال کے سوا موت کے لیے کوئی چیز مفید نہیں۔ یہ عہد نامہ کیا بلا ہے؟ ہمارے ہاں تو اس کا کوئی ذکر نہیں معلوم نہیں آپ کے علاقہ سے اللہ تعالیٰ نے کون سا نیا عہد فرمایا ہے۔

محمد اسمٰعیل السلفیؒ

الاعتصام: ۱۶ / فروری ۱۹۵۱ء

ملاقات کے وقت دست و پابوسی کی شرعی حیثیت

محترم مدیر مجلہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مکتوب جوابی ملا۔ سوال کسی قدر تفصیل طلب ہے اس لیے کارڈ کے بجائے ملفوف لکھ رہا ہوں۔ امید ہے گذارشات پر سرفرقہ نوازی سے ہٹ کر انصاف پسندی سے غور کیا جائے گا۔

(۱) اصل مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے ایک قاعدہ سمجھ لیجیے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے جس کی تکمیل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور سنت سے قریباً ۲۳ سال میں ہوئی۔ آپ کسی معاملہ کو اس کے پسِ منظر اور عوامل سے الگ کرکے اس سے استنباط یا اس پر عمل کی کوشش فرمائیں گے تو بہت ممکن ہے کہ مقاصدِ دینی سے انحراف کے مترادف ہو۔ اعمال میں اباحت، استحباب یا سنّت کا فیصلہ کرنے سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سال کا عمل اور عام طریقہ زندگی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ورنہ اسلام ایک کھیل بن جائے گا اور یہ جزوی مباحث ختم ہونے میں نہیں آئیں گے اور ایسی چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی جن پر عمل کرنا آپ کے لیے ناممکن ہوگا۔

(۲) اب اصل سوال پر غور فرمائیے ہاتھ اور پاؤں چومنے کا واقعہ پوری عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو دفعہ پیش آیا۔ ایک دفعہ چند یہودیوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امتحان کے طور پر بعض سوالات دریافت کیے اور جوابات کو خلاف توقع صحیح پاکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چوم لیے۔ اسے امام ترمذی نے اپنی جامع میں ذکر فرمایا (تحفۃ الاحوذی ص۸۶ ج ۳) دوسرا واقعہ وفد عبد القیس کا ہے وہ نومسلم ہوکر ملاقات کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ (ابوداؤد) ممکن ہے تلاش سے ایک آدھ واقعہ اور بھی دستیاب ہوجائے۔ اس واقعہ سے نہ اس فعل کا استحباب ثابت ہوتا ہے نہ وجوب۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہود اور ناواقف نومسلموں نے ایسا کیا۔ اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ عام طور پر صحابہ کی یہ عادت نہ تھی۔ ہاتھوں کے بوسہ کا ذکر تو بعض صحابہؓ سے ملتا ہے لیکن پاؤں چومنے کی عادت قطعاً نہ تھی۔

(۳) اور پھر پاؤں چومنے کے یہ دو واقعے صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے باقی عام صحابہؓ نے آپس میں کبھی ایسا نہیں کیا میری نظر میں تو ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی صحابی نے دوسرے کے پاؤں چومے ہوں۔ اسی بنا پر علامہ شاطبیؒ نے ایک توجیہ میں اسے آں حضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت فرمایا ہے۔

احدها ان یعتقدوا فیہ الاختصاص و مرتبۃ النبوۃ تسع فیھا ذالک کلہ للقطع بوجود الالتماس من الخیر و البرکۃ (الی ان قال) بخلاف غیرہ من الامۃ و ان حصل لہ من نور الاقتداء بہ و الاھتداء بھدیہ ما شاء اللہ الا انہ لا یبلغ مبلغہ علی حال توازیہ فی مرتبتہ ولا تقاربہ فصار ھذا النوع مختصا بہ (الاعتصام الشاطبی ص ۱۳۶ ج ۲)

یعنی ایسی تعظیم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کیونکہ مقامِ نبوت میں ایسی خیر و برکت کی گنجائش ہے دوسرے آدمی کو آپ کی اقتداء سے گو کچھ بزرگی حاصل ہو جائے مگر وہ اس مرتبہ کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ اس لیے یہ آپؐ کی خصوصیت ہے۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ صحابہ کے ساتھ برابر بیٹھتے چنانچہ بعض اوقات اجنبی آدمی کو حضرت کی پہچان میں دقت ہوتی اور دریافت کرنا پڑتا۔

(۴) یہودی اور اس اجنبی وفد نے جو کچھ کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے روکا نہیں بلکہ خاموش رہے لیکن کبار صحابہ جیسے عشرہ مبشرہ یا اصحابِ بدر رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے آپؐ کے پاؤں کو کبھی بوسہ نہیں دیا اس سے ظاہر ہے کہ اگر یہ مستحسن ہوتا تو صحابہ عام طور پر اس پر عمل فرماتے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلقین فرماتے۔ امت میں تواتر سے اس کا رواج اور عمل ہوتا حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، آئمہ اربعہ رحمہم اللہ کسی سے بھی یہ ثابت نہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے پاؤں کو بوسہ دیتے ہوں۔

(۵) اس کی وجہ صرف اسی قدر معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی ناواقف شخص ایسا فعل کرے اور مصلحتاً کوئی عالم یا بزرگ اس پر خاموش رہے تو یہ خاموشی جرم نہیں۔ نو مسلم اور نو وارد وفود کو اگر اس طرح ٹوکا جائے تو ان میں تنگ دلی پیدا ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے مناسب ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بتدریج تعلیم دی جائے مگر ظاہر ہے کہ ایسے اعمال میں شریعت کا رجحان ناپسندیدگی کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے امور نہ صحابہؓ اور نہ آئمہ میں قابلِ عمل قرار پا سکے نہ امت میں ان پر تعامل ہوا۔ اگر اس باب میں تھوڑی سی رخصت دی جائے تو عامۃ الناس اس میں غلو شروع کر دیتے ہیں۔ امام شاطبیؒ فرماتے ہیں۔

ولان العامۃ لا تقتصر فی ذالک علی حد بل تتجاوز فیہ الحدود و تبالغ بجھلھا فی التماس البرکۃ (الاعتصام ص ۱۳۷ ج ۲)

یعنی عوام ایسے معاملات میں غلو شروع کر دیتے ہیں اور جائز حد سے گزر جاتے ہیں اس لیے ذریعہ کے طور پر یہ امور ممنوع قرار پائے۔ اور اس وقت بھی نادرست اور ممنوع ہیں۔

(۶) مذکورہ دونوں احادیث جو ہاتھ چومنے کے متعلق ہیں ایک میں یہ عمل یہودیوں نے کیا حالانکہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی سمجھتے تھے نہ آپؐ کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات کی صحت کا اقرار کیا یا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی صحیح سمجھا۔ مگر انہیں ایمان نصیب نہیں ہوا اس لیے ان کے اس فعل کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ یہ تعظیم منافقانہ ہے لہذا ان کی کوئی پرواہ نہیں کی اور صحابہ نے کبھی آرزو نہیں کی کہ وہ ان منافق یہودیوں کی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کریں۔ دوسرا واقعہ ان ناواقف لوگوں کا ہے جو قبیلہ عبد القیس سے تعلق رکھتے تھے اور نو مسلم تھے۔ تعجب ہے یہود اور نو مسلموں کے اس فعل سے استدلال فرمایا جا رہا ہے جو عمر میں ایک ایک دفعہ ان کو پیش آیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ مصلحتاً خاموش رہے اور کبار صحابہ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل فارس کے قیام تعظیم کو بھی ناپسند فرمایا۔ ارشاد ہے، لَا تَقُومُوا كَمَا تَقُومُ الْاَعَاجِمُ عجمی اپنے امراء اور بزرگوں کے لیے کئی کئی دفعہ قیام کرتے۔ جب بھی وہ کھڑے ہوتے یہ بچارے قیام کرتے اور یہ واقعہ دن میں کئی کئی دفعہ پیش آتا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا نیز جو اس قیام کو پسند کرے اسے جہنم کا مستحق قرار دیا مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ النَّاسُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (مشکوٰۃ) "جو شخص پسند کرے کہ لوگ اس کے لیے سر و قد کھڑے ہوں اسے اپنا مقام جہنم میں سمجھنا چاہیے" صرف قیام استقبال کی اجازت مرحمت فرمائی جو خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمہؓ کا معمول تھا جیسا کہ سنت سے ظاہر ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عام زندگی جس میں اس قدر انکساری اور تواضع موجود ہے کو دیکھتے ہوئے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پابوسی پسند فرماتے تھے۔

(۷) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے آپ کو معلوم ہوگا کہ آپؐ اپنے گھر میں ڈول اور جوتے تک کو پیوند لگایا کرتے تھے وہ اپنی ذات کو پابوسی کے لیے کیونکر پیش فرما سکتے تھے۔ صحابہ فرماتے ہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء میں اس طرح رہتے تھے جیسے ان میں سے ایک ہوں۔ حضرت خدیجہؓ نے آپکی سیرت کے متعلق فرمایا:

وَاللّٰهِ لَنْ يُّضِيْعَكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں فرمائے گا۔ آپ غیروں کے لیے دکھ اٹھاتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں اور حق کی راہ میں

مصائب برداشت فرماتے ہیں۔" جو لوگ پابوسی کے خواہش مند ہوں یا اسے پسند کرتے ہوں وہ اتنا ایثار اور قربانی کہاں کر سکتے ہیں۔

(۸) اگر استدلال کا یہ طریق پسند کر لیا جائے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اتفاقات اور نوادر کو سنت یا استحباب کا مرتبہ دینے کا فیصلہ کر لیا جائے تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ احادیث میں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ بعض اوقات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خون بہہ گیا چنانچہ عبداللہ بن سنان نے احد کے دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کا خون چوس کر پی لیا۔ اسی طرح ایک دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگی لگوائی اور عبداللہ بن زبیرؓ سنگی سے نکلا ہوا خون پی گئے۔ (شفا قاضی عیاض ص۴۱ ج ۱) عیاض فرماتے ہیں ولم ینکر علیہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خون پینے کو برا نہ سمجھا" کیا ہمارے دوست جو قدم بوسی کرانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں اپنے احباب کو خون عطا فرمانے کے لیے بھی تیار ہوں گے۔ کیا خانقاہی نظام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ان اعمال پر غور کرے گا۔ آج تک تو یہ اتفاقات اور نوادر ان بزرگوں کی نظر سے غائب ہی رہے۔

(۹) صلح حدیبیہ کے وقت جب کفار کے نمائندہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا انی اری وجوھا منکرۃ۔ یعنی یہ مختلف قبائل کے آدمی جنگ میں آپ کے کام نہیں آسکیں گے تو صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی اور گلے کا بلغم ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور اپنے بدن پر مل لیا چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی یہ دیکھ بہت متاثر ہوئے اور کہا میں نے کسریٰ اور قیصر کے دربار دیکھے ہیں۔ میں نے ولاۃ کے درباریوں کو اپنے بادشاہوں کا اتنا عقیدت مند نہیں پایا جس قدر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی آپؐ کی عزت کرتے ہیں۔ یہ اتفاق ہوا اور ایک دفعہ ہوا جسے مصلحۃً برداشت کیا گیا۔ اس سے یہ استدلال صحیح نہیں ہوگا کہ حضرات مریدین اپنے پیر صاحبان کے ناک اور گلے کا بلغم چاٹنا شروع کر دیں اور اسے عزت سے تعبیر کریں۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں:

وَقَدْ رُوِیَ نَحْوُ هٰذَا فِی اِمْرَأَةٍ شَرِبَتْ بَوْلَهٗ فَقَالَ لَنْ تَشْتَکِیْ وَجَعَ بَطْنِكِ اَبَدًا۔

(صححه الدارقطنی) (شفا ص۴۱ ج ۱)

ایک عورت نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشاب پی لیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں پیٹ کا درد نہیں ہوگا۔

بعض نے اس عورت کا نام ام ایمن بتایا ہے اور بعض نے کچھ اور۔ ان روایات میں بشرطیکہ یہ صحیح بھی ہوں، جن نادر واقعات کا ذکر آیا ہے یہ محض اتفاق ہے۔ کوئی عقلمند بھی اس سے یہ استدلال

نہیں کرے گا کہ بزرگوں کا پیشاب پینا سنّت ہے۔ ہمارے بریلوی دوستوں کی روش اس معاملہ میں بہت غلط ہے اور جذبات بے حد رکیک، مجھے خدشہ ہوتا ہے کہ کوئی صاحب پیشاب پہ قیاس کر کے پاخانہ کی اباحت کا دعویٰ نہ کر دیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات پاک ہوں یا پلید ان کے استعمال کی عادت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ صحابہ، تابعین، آئمہ اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کوئی بھی ان فضلات کا استعمال مستحب نہیں سمجھتا یہی حال قدم بوسی کا ہے جو اتفاقاً پیش آگیا اس سے اس کے مسنون یا مباح ہونے کا استدلال کرنا جہالت ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو سوءِ فہم اور غلو فی الدین سے بچائے۔ اور حق بات کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

الاعتصام: ۴ر دسمبر ۱۹۵۳ء

رویتِ ہلال اور مشینی آلات[1]

اس سال شعبان کی آخری تاریخ کو مطلع ابر آلود تھا۔ لاہور اور اس کے نواحی علاقوں میں ابر محیط تھا چنانچہ رمضان المبارک کا چاند نظر نہ آسکا۔ لیکن سرِ شام اور پھر نو بجے تک کافی مقامات سے اطلاعات آگئیں کہ اکثر مقامات پہ چاند واضح طور پہ دیکھا گیا اور بڑی کثرت سے دیکھا گیا ہے جسے یقینی اطلاع کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اطلاعات چونکہ ریڈیو وغیرہ مشینی اور سرکاری ذرائع سے آئی تھیں اس لیے بعض اہلِ علم نے انہیں غیر مستند سمجھا۔ اور روزہ نہیں رکھا۔

یکم رمضان کو جمعہ تھا بعض حضرات نے بڑی جسارت کی اور بوقتِ خطبہ لوگوں کو روزہ توڑنے پر مجبور کیا۔ اس سے عامۃ المسلمین میں کافی تشویش پیدا ہوئی۔ بعض مقامات پہ نزاع نے ہنگامہ کی صورت اختیار کر لی۔ علماء کے عقیدت مندوں نے عقیدت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مخالف فریق کے علماء کو برا بھلا بھی کہا۔ بعض مقامات پر اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے اشتہارات تقسیم کیے گئے۔ انعامات کا اعلان کیا۔

[1] مولانا مرحوم نے جب یہ مضمون لکھا اس وقت حکومت کے زیرِ اہتمام مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی قائم نہ ہوئی تھی اور اس بناء پہ رمضان المبارک یا عیدین کے مواقع پر کبھی مختلف مکاتبِ فکر میں اختلاف و انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی تھی لیکن آج کل بحمد اللہ یہ صورت پیدا نہیں ہوتی اس لیے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے سے مطابق چاند ہونے یا نہ ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ مولانا مرحوم کے قلم سے نکلے ہوئے یہ مضمون اپنا ایک علمی مقام رکھتے ہیں اور عوام و خواص کے سلسلہ میں بہت کچھ افادیت موجود ہے۔ (ناشر)

جبکہ بعض لوگوں نے روزہ توڑنے سے انکار کیا۔ اس قسم کی جرأت اور علمی نمائش کے بعد ایسے حالات کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ رویتِ ہلال کے مسئلہ پر کتاب وسنت اور نئے حالات کی روشنی میں غور کیا جائے۔ ان گزارشات کا مقصد کسی کی تردید یا تائید نہیں بلکہ صورتِ حال کا بقدرِ امکان جائزہ لینا ہے اور صحیح شرعی پوزیشن کی تلاش۔

شریعت میں رویتِ ہلال اور اس کی تصدیق کے لیے مختلف راہیں اختیار فرمائی گئی ہیں۔

(۱) مطلع صاف ہو تو چاند واضح طور پر نظر آجائے تو اس صورت میں یہ خبر ہی رویت کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ جن لوگوں نے چاند نہ دیکھا ہو انہیں دیکھنے والوں کی اطلاع پر اعتماد کرنا چاہیئے اور اگر کسی جگہ کسی عذر کی وجہ سے یا کوئی معذور چاند نہ دیکھ سکے تو اسے اس رؤیتِ عامہ پر اعتماد کرتے ہوئے اس ظن کو قبول کرنا چاہیے۔ جسے شارعِ حکیم نے ایسے مواقع پر احکام کے لیے کافی سمجھا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی فرماتے ہیں:

وقبل بلا علة جمع عظیم یقع العلم الشرعی وغلبة الظن بخبرھم وھو مفوض الی رأی الامام من غیر تقدیر بعدد (درالمختار صـ۱۵۲ ج۱)

"ایسی جماعت کی اطلاع جس سے گمانِ غالب ہو کہ چاند طلوع ہو گیا قبول کر لی جائے گی۔ امام یا حاکم کا فیصلہ اس میں کافی ہے اور شرعاً کوئی تعداد اس کے لیے معین نہیں۔"

غرض حکام تک چاند ہونے کی اطلاع بھیجنا اور اس بارے میں ان کا فیصلہ کافی ہے۔ اس کے بعد کسی شرعی شہادت کی ضرورت نہیں۔

(۲) مطلع ابر آلود ہو یا افق پر غبار آگیا ہو اور بعض مقامات پر اکثر لوگ چاند نہ دیکھ سکیں تو رویت ثابت کرنے کے لیے شہادت کی ضرورت ہوگی۔ امام احمدؒ، ابنِ مبارک فرماتے ہیں کہ ایک شہادت کافی ہوگی۔

امام شافعیؒ سے بھی ایک روایت اس طرح ہے:

وقال فی القدیم والجدید تقبل من عدل واحد وھو الصحیح لما روی ابنُ عُمَرَ تَرَائَی النَّاسُ الْھِلَالَ فَاَخْبَرْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّی رَأَیْتُہٗ فَصَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وَاَمَرَ النَّاسَ بِالصِّیَامِ ولانہ ایجاب عبادۃ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیم وجدید قول یہ ہے کہ ایک عادل گواہ کی شہادت کافی ہوگی اور یہی صحیح ہے چنانچہ عبداللہ بن عمر سے مروی ہے لوگ چاند دیکھ رہے تھے میں نے چاند دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی آپؐ نے میری شہادت پر خود بھی روزہ رکھا۔ اور

فنقبل من واحد احتیاطا۔ (المہذب قلمی نسخہ کتاب الصیام) لوگوں کو بھی حکم دیا۔ اور چونکہ اس سے ایک عبادت واجب ہوتی ہے اس لیے احتیاط کے طور پر ایک ہی شہادت قبول فرمائی۔

امام شافعیؒ سے ایک اور روایت دو شہادتوں کے متعلق بھی آئی ہے۔ (نیل الاوطار ص۱۹۰ ج ۴)

فقہائے حنفیہ کا رجحان بھی رمضان کے متعلق ایک شہادت کی طرف ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ویقبل فی الشهادة علی رؤیته هلال رمضان رجل واحد مسلم او امرأة واحدة مسلمة اینما شهد بذالك وحده قبلت شهادته علیه عدلا كان الشاهد بذالك او غیر عدل بعد ان یكون یشهد انه رآه خارج المصر و انه رآه فی المصر و فی السماء علة تمنع العامة من التساوی فی رؤیته اھ (مختصر الطحاوی ص۵۶ شامی ص۱۲۳ ج۲ ایضاً بدائع ص۸۱ ج۲)

مطلع صاف نہ ہو تو ایک مرد یا ایک عورت کی شہادت کافی ہے۔ اس کے لیے عدالت بھی ضروری نہیں۔ اس میں ایک عورت کی شہادت مرد کے برابر ہوگی۔

علامہ علاؤ الدین ابو بکر بن مسعود کاسانی فرماتے ہیں چونکہ اس اطلاع کا اثر اطلاع دینے والے پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے یہ شہادت نہیں خبر ہے۔ ولیس هذا بشهادة بل هو اخبار بدلیل ان حكمه یلزم الشاهد اھ (بدائع والصنائع للکاسانی ص۸۰ جلد ۲)

اگر فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کی یہ توجیہہ قبول کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک آدمی کی اطلاع پر بھی رویت کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ فقہاء حنفیہؒ کی نظر اس مسئلہ میں انسانی نفسیات پر ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان بلا ضرورت جھوٹ نہیں بولتا۔ رمضان کے چاند کی اطلاع میں کسی کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں اس لیے اس خبر میں جھوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا۔ امام طحاوی کے ارشاد کو فقہائے حنفیہ نے عدالت کے معاملہ میں ظاہر روایات کے خلاف فرمایا ہے۔ (البدائع والصنائع کاسانی ج۲ ص۸۱)

(۳) کہیں چاند نظر آجائے۔ کسی دوسرے شہر میں ابر غبار یا کسی عارضہ کی وجہ سے چاند نظر نہ آسکے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں اطلاع کے لیے خبر دی جا سکتی ہے۔ بعینہٖ شہادت یا عدالت تو دوسرے شہر میں منتقل نہیں ہو سکے گی اگر خبر اور اطلاع کو ساقط الاعتبار سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چاند جہاں دیکھا جائے وہیں روزے رکھے جائیں۔ دور یا قریب اطلاع کا کچھ فائدہ نہیں۔ شہادت اور خبر کے اصطلاحی فرق سے اس قدر غلط فائدہ اٹھانا پسندیدہ طریقہ نہیں۔ رمضان المبارک کی فضیلت کے

پیش نظر یہ ٹیکنیکل فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب ایک اطلاع ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل کی جائے اور وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے مل جائے تو اس پر یقین کرنا چاہیے۔ اصطلاحی مباحث میں الجھنا دیانۃً درست معلوم ہوتا ہے نہ اس سے شارع حکیم کے مقاصد کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔

علامہ کاسانی محدود بالقذف کی شہادتِ رویتِ ہلال کے متعلق فرماتے ہیں:

روی ابو یوسف عن ابی حنیفۃ ان شہادۃ المحدود فی القذف (بر دیتہ) الھلال لا تقبل والصحیح انھا تقبل وھو روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃ لما ذکرنا انھا خبر ولیس بشھادۃ وخبرہ مقبول وتقبل شھادۃ واحد عدل علی واحد عدل فی ھلال رمضان بخلاف الشھادۃ علی الشھادۃ فی سائر الاحکام انھا لا تقبل مالم یشھد علی شھادۃ رجل واحد رجلان او رجل وامرءتان لما ذکرنا ان ھذا من باب الاخبار لا من باب الشھادۃ ویجوز اخبار رجل عدل کما فی روایۃ الاخبار اھ (بدائع ص۸۲ ج۲)

جس شخص کو حدِ قذف لگائی گئی ہو امام ابو یوسفؒ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرماتے ہیں کہ ہلال کے معاملہ میں اس کی شہادت مقبول نہیں ہوگی۔ صحیح یہ ہے کہ ہلال کے متعلق (باقی احکام کے خلاف) اس کی شہادت مقبول ہوگی۔ کیونکہ یہ اصل خبر اور اطلاع ہے شہادت نہیں۔ اس طرح ایک عادل آدمی کی شہادت کی اطلاع دوسرا عادل آدمی رویتِ ہلال کے متعلق دے سکتا ہے۔ (بخلاف دوسرے احکام کے) کیونکہ یہ خبر ہے شہادت نہیں۔ اور خبروں کے متعلق شہادت کی شرائط اور پابندیاں شرعاً ملحوظ نہیں رکھی گئیں۔

رویتِ ہلال کے متعلق ایک شہادت پر اعتماد احادیث صحیحہ میں بصراحت موجود ہے۔ سنت کے دفاتر اس سے بھرے پڑے ہیں۔ بخوفِ طوالت یہاں ان کا تفصیلی تذکرہ ضروری نہیں سمجھا گیا جو لوگ کتاب و سنت میں سلف کی راہ سے سوچتے اور سمجھتے ہیں الحمد للہ وہ اس قسم کی الجھی ہوئی راہوں سے کافی حد تک محفوظ ہیں۔ گو فقہائے حنفیہ نے گواہ کے عادل کے متعلق امام طحاوی کے ارشاد کو ظاہر روایت کے خلاف سمجھا ہے لیکن انسانی نفسیات کے لحاظ سے یہ قول کافی حد تک معقولیت پر مبنی ہے۔ ہلالِ رمضان کے معاملہ میں خبر دینے والے کے عادل ہونے کو اس قدر اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔ اس میں نہ عوام جھوٹ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں نہ خواص۔ نہ حکومت کو اس سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے نہ حکام کو۔ اگر اس قسم کا کوئی خطرہ کہیں پیدا ہو تو اہلِ علم علل کے مطابق احکام بدل سکتے ہیں۔ الاحکام تدور مع العلل۔

ریڈیو اناؤنسر کا عادل ہونا

ریڈیو کا تذکرہ جب بعض علماء اور ارباب فتویٰ کی زبان پہ آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو کوئی بہت بڑا جھوٹا آدمی ہے جو وہ کوئی اطلاع دے تو حضرات علماء کو خود محتاط ہو جانا چاہیے۔ اس میں اس حد تک معقولیت بھی ہے کہ عموماً جو لوگ اس محکمہ میں کام کرتے ہیں وہ متدین نہیں ہوتے۔ الا ماشاء اللہ۔ اس لیے ان کی اطلاع پہ اعتماد نہیں ہونا چاہیے۔ شہادت کے معاملہ میں تدین ضروری ہے۔ اور شہادت کی شرائط کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ اطلاعات کو نشر کرنے کا معاملہ شہادت سے مختلف ہے۔ حکومت یا ریڈیو کے ناشر اطلاعات میں بلا وجہ غلط بیانی نہیں کرتے۔ حکومت غیر مسلم ہو تو اس معاملہ میں بے اعتنائی کا امکان تو ہو سکتا ہے مگر عمداً جھوٹ یا غلط بیانی کا سوال وہاں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اب جبکہ حکومت خود مسلمانوں کی ہے گو آئین کے لحاظ سے وہ سردست کاملاً اسلامی نہیں لیکن اس کے ارباب بست و کشاد بہر حال مسلمان ہیں اور ان میں اہل علم بھی ہیں۔ پھر حکومت یا حکام کو ایسی اطلاعات کے غلط نشر کرنے میں کچھ ملکی یا سیاسی فائدہ بھی نہیں۔ ان حالات میں اس قسم کی بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں محکمہ ریڈیو کے ارباب کار شہادت کے ناقل ہیں یا دوسرے مقامات کی اطلاعات کے راوی ہیں۔ اور خاص طور پر جب حکومت نے یہ ذمہ داری لی ہے کہ وہ ایسی اطلاعات پوری تصدیق کے بعد نشر کرے گی تو دیانت دارانہ سوچ بچار کا تقاضا یہ ہے کہ مشینی آلات اور حکومت کے فیصلوں پہ بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں غور کیا جائے۔ اور ان پہ اعتبار کیا جائے۔ بریلوی حضرات اگر اس معاملہ میں غور فرمائیں تو وہ مجبور ہیں لیکن تعجب ہے کہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی جو کچھ اس سال کیا ہے اس کی ان سے امید نہ تھی۔ رات روزہ نہ رکھا گیا ہو تو اس موقف میں کچھ جان ہے مگر بوقت جمعہ بھرے مجمع میں روزہ توڑنے کے لیے کہا جائے اور اس پر زور دیا جائے یہ نہ دیانت کا تقاضا ہے نہ اخلاق کا۔ اگر یہ ضروری تھا تو کہہ دیا جاتا کہ نفلی روزہ کی نیت کر لی جائے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک شک کے دن نفلی روزہ درست ہے۔ مگر یہاں تو شک کا سوال ہی نہیں۔ شک کے جراثیم تو بعض حضرات نے زور تقریر اور قوت فتویٰ سے پیدا کیے ورنہ اطلاعات قابل وثوق تھیں۔ روزہ رکھنے میں کچھ حرج نہیں تھا۔ چاند کی بلندی اور غروب میں دیر سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو گئی تھی۔ تاہم اب تک فتوے لیے جا رہے ہیں اور روزہ رکھنے والوں کو مطعون کیا جا رہا ہے واقعہ کی صحت کے بعد ٹیکنیکل الفاظ پہ زور اور ان اصطلاحات کو شریعت کا مقصد اور مدار قرار دینا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حقیقت شناس لوگوں کا اعتماد علماء کرام پر سے اٹھ جائے گا۔ اور ان کی قوت فکر عوام کی نظر میں مطعون ہو گی۔

ظروف واحوال کا لحاظ علماءِ حق ہمیشہ اپنے فتووں میں ظروف واحوال کا خیال رکھتے رہے ہیں۔ اجتہاد کے اختلافات میں کافی حد تک یہی حقیقت ہے۔ فقہاءِ حنفیہ کا طریق عمل اس معاملہ میں اور بھی کھلا ہوا ہے۔ مفقود الخبر کے متعلق انہوں نے موالک کے قول کو قبول فرمایا قرآن وسنت کی تعلیم پر اجرت کے متعلق انہوں نے شوافع موالک اور حنابلہ کی تحقیقات کو قبول فرما کر ملک پہ اور عامۃ المسلمین پہ احسانِ عظیم کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مرتبہ کتاب الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ اسی باب میں چھپ چکی ہے۔ رویتِ ہلال کے متعلق بھی اگر اسی حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو اس کے نتائج بہت ہی مفید ہوں گے۔

اختلافِ مطالع کے متعلق اصحابِ متون نے جو روش اختیار فرمائی تھی متاخرین نے اس کے خلاف کو پسند کیا اور اختلافِ مطالع کو کسی حد تک قبول فرمایا۔

علامہ ابنِ عابدین شامی نے رویتِ ہلال کے متعلق جب آسمان صاف ہو، خبر دینے والوں کی تعداد کا ذکر فرمایا ہے۔ فقہاءِ عظام کی متعدد روایات کا ذکر کیا ہے امام کی روایت کو ترجیح دیتے ہوئے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اقول انت خبیر بان کثیرا من الاحکام تغیرت لتغیر الازمان ولو اشترط فی زماننا الجمع العظیم لا یصوم الناس الا بعد لیلتین او ثلاث لما ھو مشاھد من تکاسل الناس بل کثیرا ما رأینا ھم یشتمون من یشھد بالشھر ویؤذونہ وحینئذ فلیس فی شھادۃ الاثنین من بین الجم الغفیر حتی یظھر غلط الشاھد فاتفقت علۃ ظاھر الروایۃ فتعین الافتاء بالروایۃ الاخریٰ (شامی ص۱۴۲ ج ۲)

"تمہیں معلوم ہے کہ اکثر احکام زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے بدل جاتے ہیں۔ لوگوں کی سستی اور بے توجہی کو دیکھیے۔ اگر چاند دیکھنے کے لیے جمِ غفیر کی شرط لگائی جائے تو لوگ رمضان میں دوسری اور تیسری تاریخ ہی کو روزہ رکھ سکیں گے۔ ہم نے دیکھا ہے لوگ اسے گالیاں دیتے ہیں جو انہیں رمضان کی آمد کا پتہ دے اس لیے دو آدمیوں کی اطلاع کو کافی سمجھتے ہیں کوئی تفرد نہیں اور ظاہر روایت کے خلاف فتویٰ دینے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔"

پچھلے بزرگوں کی طرح اگر ظروف واحوال اور تغیراتِ زمانہ کی روشنی میں قدماء کے فتووں پر سوچنے کی عادت ڈال لی جائے تو ترکِ تقلید کے نام پہ اہلِ حدیث کے ساتھ جو بلا وجہ تلخی پیدا کر لی گئی ہے بآسانی سے ختم ہو سکتی ہے یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ متاخرین کا علم متقدمین ہی سے ماخوذ ہے اس لیے آپ اور ہم انہیں

آئمہ کے خوشہ چین ہیں۔ اسی خوشہ چینی میں اہل حدیث اور احناف کا انداز کس قدر مختلف ہے اگر فکر و نظر میں تھوڑی سی وسعت پیدا کر لی جائے جس طرح قرن اول میں تھی تو تلخی ختم ہو سکتی ہے اور پاک و ہند کے اہل حدیث نے اس سے زیادہ کوئی جرم نہیں کیا۔

مشینی آلات کا استعمال روز بروز اس قدر عام ہو رہا ہے کہ اس کے استعمال کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آپ حضرات بھی تبلیغی امور میں ان سے استفادہ فرماتے ہیں۔ تمام اخبارات جن کی خبروں پر زندگی کی بہت سی ضروریات کا انحصار ہے۔ ان مشینی آلات ہی کی مرہون ہیں۔ موت اور زندگی کے متعلق اطلاعات کا صحیح ترین ذریعہ یہی ہے۔ جلسوں کی حاضری، مختلف ممالک کی اطلاعات انہی ذرائع سے حاصل ہوتی ہیں۔ آپ اور ہم سب ان پر یقین کرتے ہیں۔ روزہ افطار کے وقت سائرن بجتا ہے ہم بلاشبہ روزہ افطار کرتے ہیں۔ اور کسی عدالتی شہادت کا مطالبہ نہیں کرتے۔ کاروباری لوگ کروڑوں روپیہ کا کاروبار ان آلات کے اعتماد پر کرتے ہیں ٹیلیفون پر لاکھوں سے زائد روپیہ کے سودے روزانہ ہوتے ہیں۔ وہاں ہماری نوبت اعتماد کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی۔ بغرض دینی اور دنیوی امور میں ہم ان آلات پر اعتماد کرتے ہیں۔ آخر رویت ہلال میں کون سی نزاکت ہے کہ ان کی زبان سے اطلاع آجائے تو ہم سرتا پا اعتراض بن جاتے ہیں۔ ایک معقول آدمی کی نظر میں یہ بڑی مضحکہ خیز پوزیشن ہے۔ یقیناً بعض اوقات ان آلات کے ذریعے غلطی ہونے کا بھی امکان ہے تو اس کی اصلاح کے لیے ہمیں سوچنا چاہیے نہ کہ ایک مفید چیز کو خواہ مخواہ اپنے اوپر حرام ٹھہرا لینا چاہیے۔ آخر میں ادبا گزارش ہے کہ ان آلات کے اعتماد اور ان کی افادی حیثیت کو برقرار رکھنے کے بارے میں عقلمندی سے غور فرمایئے اور عوام کو تشویش سے نکالنے کی کوشش کیجیے۔

الاعتصام: ۱۰ مارچ ۱۹۶۱ء

رویت ہلال اور خبر و شہادت کی بحث

اس سال شعبان اور رمضان کی آخری تاریخوں میں آسمان ابر آلود تھا۔ مغربی پاکستان کے وسطی علاقوں میں چاند نظر نہ آسکا۔ رمضان کا چاند کراچی سے سکھر تک بڑی کثرت سے دیکھا گیا۔ آزاد کشمیر کے قریبی علاقوں میں بھی مطلع صاف تھا اور چاند نظر آگیا تھا چنانچہ تمام مکاتب فکر کے دانشمند لوگوں نے ریڈیو اور ٹیلیفون کی اطلاع پر روزہ رکھا۔ بعض حضرات کو صحیح اطلاع نہ پہنچ سکی انہوں نے روزہ نہ رکھا۔ بعض وہم پرست حضرات نے رکھے ہوئے روزے بھرے مجمع میں تڑوا دیے اور اسے دین کی بہت بڑی خدمت تصور کیا۔

رمضان کی آخری تاریخ کو عید کا چاند حسب بیان اخبارات، لاہور اور کراچی میں چند آدمیوں نے دیکھا مقامی طور پر شہادت ہوئی اور اس کی اطلاع دوسرے شہروں کو بھی دی گئی۔ اطلاع کے ذرائع وہی مشینی تھے۔ البتہ کہیں کسی نے اصالتاً دریافت کرلیا اور اطمینان کے بعد مغربی پاکستان کے اکثر حصوں میں عید ہو گئی لیکن کراچی میں عید صرف سرکاری حلقوں نے منائی۔ عوام سرکاری اطلاعات پر مطمئن نہیں ہوئے۔ تاہم باقی اکثر شہروں میں اس شہادت کی اطلاع دے دی گئی۔ اور عام طور پر عید ہفتہ کے دن منائی گئی لیکن بعض مقامات پر عید کے دن بدستور روزہ رکھا گیا۔

غرض عید کے موقعہ پر بعض حلقوں میں خاصی بے اطمینانی رہی بعض مُلا قسم کے بزرگوں نے اشتہا بازی سے اپنے آپ کو مشہور کرنے کا اچھا موقعہ تلاش کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ بے اطمینانی ضرور ہوئی۔ اس بے اطمینانی کے اسباب میں سرکاری حلقوں کی ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں لیکن عموماً اس کا احساس نہیں فرمایا گیا۔ بہرحال جہاں خبررسانی کے ذرائع موجود تھے وہاں احساس ناپید تھا۔ اور جہاں احساس کی فراوانی تھی وہاں ذرائع موجود نہ تھے۔

کئی سوال

قدرتی طور پر اس وقت کئی سوال پیدا ہو گئے۔ مثلاً:

۱۔ کیا تار، خط، ریڈیو، ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن وغیرہ خبررسانی کے ذرائع شرعاً قابل اعتماد اور درست ہیں؟ اور جو واقعات ان ذرائع سے معلوم ہوں انہیں قبول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ رویتِ ہلال کے لیے شرعاً شہادت ضروری ہے یا خبر اور اطلاع پر بھی روزہ رکھا جا سکتا ہے؟

۳۔ عوام اگر مطمئن ہو کر عید منالیں اور حکومت کے ادارے فیصلہ کر دیں تو کیا کسی شخص کے لیے انفراداً ان کی مخالفت درست ہے؟

ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے ایک حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کے عوامی مسائل کی ذمہ داری اصلاً حکومت پر ہے ارباب حکومت کا مذہب اگر اسلام نہ ہو تو بھی عوام کی ضرورت کے پیشِ نظر اس کا صحیح اہتمام ہونا چاہیے۔ اور اس طرح ہونا چاہیے جس سے عوام مطمئن ہوں اور ان الفاظ سے ہونا چاہیے جو اسلام نے ان کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ نیز ان لوگوں کی شمولیت سے ہونا چاہیے جن پر لوگوں کو مذہبی معاملات میں اعتماد ہو اور وہ اس کی شرعی اہمیت کو سمجھتے ہوں۔

ڈائریکٹر محکمہ موسمیات کراچی نے اپنے بیان میں فرمایا ہے:

"گو میرا فرض نہیں تھا لیکن میں دونوں گواہ لے کر مولانا احتشام الحق صاحب کے پاس گیا۔"

یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟ جب آپ ایک ایسا اعلان فرماتے ہیں جس سے بحیثیت مسلمان مولانا احتشام الحق

وغیرہم کا براہِ راست تعلق ہے۔ پھر مولانا احتشام کی شخصیت ایسی ہے جس پر عامۃ المسلمین کو اعتماد ہے۔ تو آپ ان کو اعتماد میں لیے بغیر کیوں اعلان فرماتے ہیں۔ اخلاقاً، شرعاً اور بحیثیت ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آپ کا فرض ہے کہ اعلان سے قبل ان حضرات سے رابطہ قائم کریں اور ان کو مطمئن کریں۔

ہم نے ڈائرکٹر محکمہ موسمیات اور مولانا احتشام الحق صاحب کے اخباری بیانات پڑھے ہیں۔ ہمارا تاثر یہ ہے کہ چاند یقیناً دیکھا گیا۔ لیکن ان بیانات اور ان میں اختلاف سے اقتدار اور خود داری کی جنگ نمایاں ہے۔

علماء نے چاند نہیں دیکھا۔ عوام کے پاس وہ ذرائع نہیں جو محکمہ موسمیات کے پاس ہیں تو اس صورت میں صحیح طریق کار یہ تھا کہ جہاں دو افسر دوربین سے چاند دیکھ رہے تھے وہاں مولانا احتشام الحق یا مفتی محمد شفیع صاحب بھی دوربین استعمال فرما لیتے۔ اس سے دوربین کا کون سا پرزہ گھس جاتا۔ علماء کا اطمینان بہرحال محکمہ والوں کو کرانا چاہیے تھا۔

پھر یہ کیا الفاظ ہیں:

"کراچی میں چاند ہو گیا۔ ڈھاکہ میں چاند نہیں ہوا"

یہ الفاظ شرعی شہادت کے لحاظ سے قطعی غیر مبہم ہیں۔ محکمہ موسمیات کے ڈائرکٹر مسلمان ہیں۔ انہیں معلوم نہیں شہادت میں مبہم الفاظ کا استعمال نہ شرعاً درست ہے نہ قانوناً۔ اس کے لیے واضح الفاظ ہونے چاہئیں۔ مثلاً: چاند فلاں مقام پر دیکھا فلاں فلاں صاحب نے خود دیکھا۔ وہ فلاں بزرگ ہیں۔ ان کا مختصر سا تعارف ہو جانا چاہیے۔

اس دفعہ جو کچھ تھوڑا بہت انتشار ہوا ہے اس میں محکمہ موسمیات کی بے اعتنائی کو زیادہ دخل ہے وہ اگر بر وقت ذمہ دار حضرات سے رابطہ قائم فرما لیتے تو نہ ان کو تکلیف ہوتی نہ عید منانے کے سلسلہ میں ملک میں بے اطمینانی ہوتی۔

آپ خود دیکھیں، اگر سائنسدان چاند کو عبور کر کے اس سے کہیں آگے نکل جائیں تو رویت ہلال کی شرعی یا عرفی حیثیت میں کیا فرق پیدا ہو سکتا ہے وہ تو بہرحال نظر آئے گا۔

اب پیش آمدہ سوالات کے متعلق شرعی مقاصد کے لحاظ سے عرض ہے:

۱۔ اصل چیز کسی اطلاع پر یقین اور اطمینان ہے۔ یہ اطمینان کسی طرح حاصل ہو جائے شارع حکیم کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر حالات شہادت کے مقتضی ہوں تو شہادت کی شرائط پوری ہونی چاہئیں اور اگر یہ مقصد کسی دوسرے طریق سے پورا ہو جائے تو ذرائع کی بحث عبث ہے۔ اس میں بظاہر کوئی سا نب فکر

میں کوئی اختلاف نہیں جن لوگوں نے رمضان یا عید کے چاند کی اطلاع کو صرف اس لیے رد کیا ہے کہ ریڈیو تار، یا ٹیلیفون کے ذریعے سے یہ اطلاع آئی ہے۔ ان حضرات نے عقل و دانش سے جنگ لڑی ہے اب یہ ذرائع ہماری زندگی کا جزو بن چکے ہیں اور آئندہ روز بروز ان کا اعتبار بڑھ رہا ہے۔ جب ٹیلیفون پر آدمی کی آواز کو لوگ پہچانتے ہیں تو ٹیلیفون کی خبر پر کیوں اعتماد نہ کیا جائے؟ کبھی کبھی چونکہ آوازیں مل جاتی ہیں اس لیے حقیقت کو اوہام کی نذر کر دیا جائے؟ یہ فکر و نظر کے استعمال کا معقول طریقہ نہیں۔ یہ کس قدر غیر معقول بات ہوگی کہ ہم لوگ دنیا کے تمام معاملات میں ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ موت اور زندگی کے حوادث میں خطوط لکھتے ہیں، تار دیتے ہیں، ٹیلیفون سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور ان ذرائع سے آئی ہوئی خبر کو صحیح سمجھتے ہیں جلسوں کی تواریخ کی اطلاع ڈاک سے ہوتی ہے۔ دوسرے ذرائع سے پیغام بھیجے جاتے ہیں ہمیں ان کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا اور اکثر یہ اطلاعات صحیح ہوتی ہیں۔

پورا رمضان سائرن بجتا رہا۔ سب لوگ اس پر روزہ افطار کرتے رہے۔ سائرن بجتا یا گولہ چلتا تو سحری بند ہو جاتی۔ حالانکہ سائرن کی آواز میں اشتباہ اور ابہام کی زیادہ گنجائش ہے۔ لیکن ریڈیو اور ٹیلیفون کے بجائے سائرن پر یقین کرتے ہوئے سحری بند بھی کرتے رہے ہم اور روزہ افطار بھی کرتے رہے — مگر جہاں تک چاند کا تعلق ہے۔ یہ ذریعہ جھوٹا سمجھا جائے۔ یہ کس قدر غیر معقول بات ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس میں مغالطہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام ذرائع میں قرائن اور احوال کی وجہ سے اگر ظن غالب ان خبروں کی صحت کے متعلق ہو جائے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ کسی خبر کو صرف اس لیے رد کر دینا کہ وہ فلاں ذریعہ سے آئی ہے قطعاً غیر معقول ہے۔

فقہائے اسلام کی نظر میں یہ شہادت علی الشہادت کی صورت ہو سکتی ہے کسی مقام پر اگر ہلالِ رمضان دیکھا گیا تو ریڈیو نے اس شہادت کو نقل کر دیا۔ علامہ علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی (۵۸۷ھ) محدود بالقذف کے متعلق فرماتے ہیں۔

روی ابو یوسف عن ابی حنیفۃ ان شہادتہ برویۃ الہلال لا تقبل والصحیح انہا تقبل وہو روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃ لما ذکرنا ان ہذا خبر ولیس بشہادۃ وخبرہ مقبول وتقبل شہادۃ واحد عدل علی واحد عدل فی ہلال رمضان ۱؎

مقذوف کے متعلق حضرت امام ابو حنیفہؒ سے دو روایات ہیں۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں یہ شہادت مقبول نہیں حسن بن زیاد فرماتے ہیں مقبول ہے۔ کاسانی فرماتے ہیں یہ صحیح ہے فرماتے ہیں یہ خبر ہے۔ شہادت نہیں ایسی خبر سے گویا رویت ہلال ثابت ہو سکتی ہے، نیز یہ ایک عادل گواہ پر دوسرے عادل کی شہادت ہے جو ہلالِ رمضان

کے متعلق قبول کر لی جائے گی اھ (البدائع والصنائع جلد ۲ ص۸۱)

اس عبارت سے ظاہر ہے جس طرح شہادت سے ہلالِ رمضان کی رویت ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح ایک صحیح اور عادل آدمی کی خبر سے بھی ہو سکتی ہے لہٰذا بعض حضرات کا شہادت کے لیے اصرار فقہاء کے موقف سے بے خبری پر مبنی ہے۔ عفا اللہ عنا وعنہم۔

اصل چیز قرائن ہیں اگر ایک یا دو شہادتیں مل جائیں لیکن اس کے ساتھ ایسے قرائن بھی مل جائیں جن سے یہ ثابت ہو کر یہ گواہ غلط کہتے ہیں۔ تو اس صورت میں یہ شہادت بھی مسترد ہو جائے گی۔ اصل چیز صحیح اطلاع ہے۔ ذرائع اصل بحث نہیں اگر قرائن موجود ہوں تو غیر عادل اور غیر ثقہ کی روایت بھی مقبول ہو گی۔ کیوں کہ ضعیف اخبار کو کلیتہً مسترد نہیں کیا گیا۔

اصطلاحی شہادت پر اصرار اور خبر سے انکار کرنا منکرینِ حدیث کے ہاتھوں کو مضبوط کرے گا۔ کیوں کہ احادیث کا سارا سلسلہ ہی اخبار پر مبنی ہے اگر اخبار کو ساقط الاعتبار یا مشکوک سمجھا جائے تو پورا فنِ حدیث غیر معتبر اور غیر مستند سمجھا جائے گا۔ احادیث کی صحت یا ضعف کا انحصار ثقہ یا کمزور راویوں کی اخبار اور اطلاعات پر ہی تو ہے۔

رویتِ ہلال کے متعلق خبر کی حجیت اور استشہاد پر تمام فقہاء اور محدثین متفق ہیں اس لیے ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبروں کو کلی طور پر مسترد کرنا بے خبری کی دلیل ہے البتہ جب شہادت کا موقعہ ہو تو شہادت پر ہی اعتماد ہو گا۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ واقعہ کی تصدیق ہو جائے اور تصدیق کا ذریعہ خواہ کوئی بھی شہادت یا خبر ہو پھر یہ اطلاع ریڈیو سے ہو یا فون سے یا کوئی اور مصدقہ طریقِ اطلاع ہو، سب صحیح ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ریڈیو اور دیگر سرکاری محکموں میں کام کرنے والے لوگ عام طور پر متدین نہیں ہوتے لیکن اس میں ان آلات کا کیا قصور ہے۔ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ وہاں متدین آدمی رکھے یا کم از کم وہ اس قسم کے اعلانات متدین اہلِ علم حضرات سے کرائے۔

بایں ہمہ اس دفعہ بعض دیوبندی اور اکثر بریلوی دوستوں نے بے چارے ٹیلیفون اور ریڈیو کی جو گت بنائی ہے وہ معقول اور پسندیدہ طریق نہیں۔

۲۔ خبر اور شہادت میں واقعی فرق ہے لیکن جہاں تک کسی معاملہ کی تصدیق و توثیق کا تعلق ہے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ فرق اس میں ہے کہ بعض لوگ اگر خبر دیں مقبول ہو گی لیکن ان کی شہادت مقبول نہیں۔ اکیلی عورت شہادت نہیں دے سکتی۔ خبر دے سکتی ہے اس لیے جہاں تک رویتِ ہلال کی توثیق اور تصدیق کا تعلق ہے اس میں دونوں مفید اور موثر ہیں لہٰذا شرعاً بعض مواقع پر رویتِ ہلال میں خبر سے استفادہ کیا گیا ہے اور

بعض اوقات شہادتِ شرعی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں ایک اعرابی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ روزہ کا اعلان کر دو۔

فقہائے حنفیہ فرماتے ہیں یہ شہادت نہیں خبر ہے۔ کاسانی فرماتے ہیں:

لان هذا ليس بشهادة بل هو اخبار بدليل ان حكمه يلزم الشاهد (البدائع والصنائع ص۸۲ج۲)

یہ شہادت نہیں بلکہ خبر ہے۔ کیوں کہ اس کا اثر خبر دینے والے پر بھی پڑتا ہے۔

اسی طرح مقذوف اگر چاند ہونے کی شہادت دے تو قبول کر لی جائے گی۔ کیوں کہ یہ خبر ہے شہادت نہیں اس سے ظاہر ہے کہ فقہائے عراق کے نزدیک بھی خبر سے چاند کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

ایک بہت بڑے بزرگ کے ارشادات بھی سنیے وہ محلیٰ میں فرماتے ہیں۔

مسئلہ ۷۵، من صح عنده بخبر من يصدقه من رجل واحد او امرأة واحدة عبد او حر او امة او حرة فصاعدا ان الهلال قد رأى البارحة فى آخر شعبان ففرض عليه الصوم صام الناس او لم يصوموا۔

(محلی ابنِ حزم ص۲۳۵ ج ۲)

اگر معتمد خبر مل جائے کہ ایک مرد یا ایک عورت، غلام یا آزاد نے گذشتہ رات چاند دیکھ لیا ہے تو اس پر روزہ فرض ہے۔ لوگ روزہ رکھیں یا نہ رکھیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ رمضان کے چاند میں تو ہمارے ساتھ اتفاق فرماتے ہیں مگر شوال کے متعلق ان کا خیال ہے کہ دو آدمیوں کی شہادت ضروری ہے۔

ابنِ حزمؒ فرماتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا تناقض ہے اور مسئلہ بے دلیل ہے۔ پھر ص۲۳۶ جلد ۶ میں فرماتے ہیں۔

فاما نحن فخبر الكافة مقبول فى ذالك وان كانوا كفارا او فساقا لانه يوجب العلم ضرورة اھ

ہمارے ہاں تو چاند کے معاملہ میں فاسق اور کافر کی اطلاع بھی درست ہے۔ کیوں کہ اسی سے بقدر ضرورت علم ہو جاتا ہے بشرطیکہ یہ اطلاع عام الناس دیں۔

اہلِ علم کی وسعتِ ظرف اور رفعتِ خیال ملاحظہ فرمائیے اور سوچیے کہ آپ کہاں ہیں اور اہلِ علم کی پرواز تحقیق

کہاں ؟

ابن حزمؒ کی پوری بحث آثار کے لحاظ سے قابل غور ہے۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ صحیح خبر کو قبول کیا جائے۔ خواہ کہیں سے بھی آئے۔

مغنی ابن قدامہ کے شارح فرماتے ہیں :

وان اخبرہ برؤیۃ الھلال من یثق بقولہ لزمہ الصوم وان لم یثبت ذلک عند الحاکم لانہ خبر بوقت العبادۃ یشترک فیہ المخبر والمخبر لشبیہ الخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخبر عن دخول وقت الصلوٰۃ الخ (ص ۹ ج ۳)

اگر کوئی ثقہ آدمی چاند کی اطلاع دے تو روزہ واجب ہوگا۔ گو حاکم اس اطلاع کو مسترد کردے کیوں کہ عبادت کے وقت کی اطلاع ہے اس میں خبر دینے والا اور جسے خبر دی گئی ہے برابر ہیں یہ احادیث روایت کرنے یا نماز کے وقت کی اطلاع دینے کے مشابہ ہے جس میں صرف مؤذن کی اطلاع کافی ہوتی ہے)

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"اگر یہ اطلاع کسی عورت کی زبانی ہے تو قیاس یہ ہے کہ یہ بھی مقبول ہوگی" امام ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ (مگر شافعیؒ سے ایک روایت اس کے خلاف بھی ہے) کیونکہ یہ ایک دینی اطلاع ہے یہ حدیث کی روایت یا سمتِ قبلہ کی اطلاع یا نماز کے وقت کی خبر کے مشابہ ہے۔ جیسے وہاں صرف خبر کافی ہے چاند کے متعلق بھی خبر ہی کافی ہے۔ اھ

آج کل بڑے شہروں میں سائرن کی آواز اور قصبات میں موذن کی آواز یا نوبت کی آواز پر روزہ رکھا اور افطار کیا جاتا ہے یہ خبر ہے شہادت نہیں فقہائے حنابلہ کے نزدیک بھی کا معاملہ بھی بعض وقت اسی نوعیت کا ہوتا ہے بعض آئمہ نے بڑی صراحت سے خبر کی حجیت کا اعتراف فرمایا ہے۔ وہ ہلال کے بارے میں ایک شہادت کے متعلق جس قدر احادیث آئی ہیں انہیں خبر پر محمول فرماتے ہیں اور اسے شہادت سمجھتے ہی نہیں۔ فقہائے عراق بھی اس توجیہ میں پیش پیش ہیں۔ جیسا کہ سابقہ منقولات سے ظاہر ہے۔ اور فقہائے اہل حدیث بھی اس مسئلہ میں فقہائے عراق رحمہم اللہ کے ہم نوا ہیں۔

خطابی فرماتے ہیں :

وقد روی عن عمر بن الخطاب من طریق عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ انہ اجاز شہادۃ

"عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے مروی ہے حضرت عمرؓ نے عید الاضحیٰ اور عید فطر کے چاند میں ایک آدمی کی

رجل فی اضحی او فطر ومال الی ھذا القول بعض اھل الحدیث وزعم ان باب رؤیۃ الھلال باب الاخبار فلا یجری مجری الشہادات الا تری ان شہادۃ الواحد مقبولۃ فی رؤیۃ ھلال شہر رمضان فکذلک یجب ان تکون مقبولۃ فی ھلال شہر شوال اھ

(معالم السنن ص۱۰۱ جلد ۲)

شہادت کو قبول فرمایا۔ بعض اہل حدیث کا بھی یہی خیال ہے کہ رؤیت ہلال کا مسئلہ از قبیلِ اخبار ہے از بابِ شہادت نہیں۔ اس لیے اس میں شہادت کی پابندیاں ملحوظ نہیں رکھی جاسکتیں جس طرح رمضان میں ایک آدمی کی شہادت مقبول ہے شوال کے چاند میں بھی اسے مقبول ہونا چاہیے" اھ

گویا احناف، اہل حدیث، سنا بہ ہلالِ رمضان کے متعلق خبر ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ عام حالات میں اس کے لیے شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خطابی کا خود رجحان چونکہ مالک کی طرف ہے اس لیے وہ اپنا اختلاف ظاہر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

لکن بعض الفقہاء ذھب فی ان رویت ھلال شہر رمضان خصوصا من باب الاخبار وذلک لان الواحد العدل کان عند جماعۃ من العلماء اھ (معالم السنن ص۱۰۱ ج ۲)

"لیکن بعض فقہاء ہلالِ رمضان کا مسئلہ اخبار ہی کی قسم سے سمجھتے ہیں اسی لیے ایک شہادت پر کفایت فرماتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اطلاع خبر کی قسم سے ہے۔

ص۱۰۲ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک ہلال رمضان کے متعلق ایک ہی آدمی کی شہادت کافی ہے اگرچہ وہ غلام ہو یا لونڈی۔ اسی طرح ایک عورت کی شہادت بھی کافی سمجھتے ہیں۔ امام طحاوی ظاہر روایت کے خلاف مرد، عورت، غلام، لونڈی، عادل، غیر عادل سب کی اطلاع کو کافی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ دراصل شہادت ہے ہی نہیں بلکہ خبر ہے اطلاع ہے۔

ان نقول سے واضح ہوتا ہے کہ ہلالِ رمضان کے لیے شہادت ضروری نہیں۔ البتہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک ظاہر روایت کے مطابق مخبر کا ثقہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن امام طحاوی یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ایک لطیفہ اس قسم کے مضامین میں شاید مقامی تذکرہ بھلا نہ لگتا ہو لیکن بطورِ لطیفہ اور واقعہ کے یہ غالباً نامناسب بھی نہ ہوگا کہ بعض اچھے بھلے اہلِ علم اور سمجھدار حضرات پر بھی ٹیلی فون وغیرہ کی خبر سے کس قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

معلوم ہے اس سال ۲۹ رمضان کو مطلع ابر آلود تھا چاند کے متعلق تشویش تھی۔ عشاء کی نماز پڑھ رہے

تھے کہ ریڈیو نے اطلاع دی کہ کراچی میں چاند ہو گیا ہے۔ تقریباً بارہ تیرہ آدمی ہمارے ہاں مسجد میں اعتکاف کر رہے تھے۔ وہ اعتکاف ختم کرنے کے لیے دریافت کر رہے تھے۔ میں اس قدر ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے کوشش کی کہ لاہور یا کراچی سے رابطہ قائم کیا جائے اور صورتِ حال دریافت کی جائے پوری کوشش کے باوجود کراچی سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ دفتر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث میں صدرِ محترم مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث رات کو تقریباً گیارہ بجے مل سکے۔ مولانا نے فرمایا جامعہ اشرفیہ کے مہتمم مولانا مفتی محمد حسن صاحب اور مولانا مفتی محمد جمیل کے پاس قابلِ اعتماد شہادت آگئی ہے اس لیے مولانا ابوالبرکات صاحب کے سوا پورے لاہور میں ہفتہ کے دن عید کا فیصلہ ہو گیا ہے اس ساری گفتگو میں .... خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ وہیں موجود تھے میں نے انہیں پیغام بھیج کر بلا لیا تھا۔ کہ جو فیصلہ ہو اتفاق سے ہو۔ میں نے ریسیور مولانا .... کو دے دیا تاکہ مولانا خود مولانا غزنوی سے براہِ راست گفتگو فرمالیں۔ میں نے اس کے بعد مولانا .... سے عرض کیا کہ اب تو شرعاً عید کا فیصلہ ہفتہ کے دن ہو جانا چاہیے۔ مولانا نے فرمایا ہاں مجھے تو یقین ہو گیا لیکن ذرا معاملہ شریعت کے مطابق ہو جائے۔ میں مولانا کی یہ بات سمجھ نہ سکا کہ اب شریعت کے ساتھ مطابقت کا کیا مطلب ہے؟

میں خاموش رہا ایک بہت بڑا ہجوم یہ گفتگو سن رہا تھا ان سب سے کہنا شروع کر دیا کہ عید کل ہو گی۔

صبح مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ مولانا .... دو تین حضرات کے ہمراہ رات لاہور گئے اور مولانا مفتی محمد جمیل صاحب سے مل کر ... ان کی زبانی چاند دیکھنے کی اطلاع لائے پھر ان کو اطمینان ہوا۔

میں اسے لطیفہ سمجھتا ہوں۔ مولانا .... پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی ہیں۔ اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو مولانا کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی پر اعتماد نہیں تھا۔ یا پھر فون کے بجائے مولانا محمد جمیل صاحب سے بالمشافہ بات سننا چاہتے تھے۔ میری رائے میں اس توثیق کی حیثیت وہم سے زیادہ نہیں۔ فون پر آواز پہچان کر لاہور جانا، پھر اسے شریعت کی مطابقت سے تعبیر کرنا ایک پڑھے لکھے سنجیدہ آدمی کے لیے نامناسب ہے اور اگر یہ فون سے گھبراہٹ ہے تو اور بھی معیوب اور مضحکہ خیز ہے۔ پھر یہاں کے بریلوی بزرگ جنہوں نے یکم رمضان المبارک کو جمعہ کے دن روزے تڑوائے تھے وہ اپنے ایک مرید کی جیپ لے کر لاہور گئے۔ اور اپنے کسی بریلوی بزرگ سے مل کر عید لائے۔ اور تقریباً سات بجے تک ان کے مقتدی روزے سے رہے ان کی اپنی بریلوی عید بریلوی جیپ میں سوار ہو کر آئی تو ان بے چارں کی جان میں جان آئی۔

علماء دین یہ تعصب، باہم بے اعتمادی اور بغض یا پھر وہم پرستی اور ریڈیو یا فون کے نام سے دشمنی

نہ کوئی علمی کارنامہ ہے نہ عقل و شعور کا تقاضا حضرات علماء وسعت ظرف کے داعی ہیں یہی توہمات میں مبتلا ہو جائیں تو عوام کا خدا حافظ۔

ان حالات میں پڑھے لکھے اور باشعور حضرات ان توہم پرستوں کا اگر مذاق اڑائیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ بریلوی حضرات سے تعجب نہیں لیکن حضرات دیوبند کی یہ ریڈیو یا فون دشمنی میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ اللھم وفقنالما تحب وترضیٰ ۔۔

۳۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الاضحیٰ یوم تضحون و الفطر یوم تفطرون (ترمذی)

"یعنی بادشاہ یا عامۃ المسلمین جب افطار کا فیصلہ کر لیں یا عید منائیں تو ان کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیے"

حافظ مقدسی مغنی کی شرح میں فرماتے ہیں:

وعنہ روایۃ ثالثۃ ان الناس تبع للامام فان صام صاموا و ان افطر افطروا وھو قول الحسن وابن سیرین لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم " الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون والاضحیٰ یوم تضحون " قیل معناہ ان الصوم والفطر مع الجماعۃ ومعظم الناس قال الترمذی حدیث حسن غریب ص۵/۳۔

لوگ اس معاملہ میں امام کے تابع ہیں متذکرہ صدر حدیث کا یہی مطلب ہے کہ عوام اور امیر المسلمین کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیے اختلاف اور تفریق پیدا کرنے سے بچنا چاہیے۔

مقصد شارع حکیم کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں تفریق پسند ذہن اسلام کے خلاف ہے۔ اگر عامۃ المسلمین روزہ رکھ لیں تو توڑنا درست نہیں اور اگر عید سمجھ کر افطار کر لیں تو ان کو روزہ پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں گوجرانوالہ کے ایک بریلوی مولوی صاحب نے کراچی کی صحیح اطلاع کے باوجود روزے تڑوا دیے تھے وہ اپنے ضمیر کی چوری اور اپنی غلط روش کو چھپانے کے لیے اشتہاروں کی بھرمار کر رہے ہیں گویا وہ اپنی غلطی کے خلا کو اشتہاروں سے پُر فرما رہے ہیں اور وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ:

ایک صحیح اطلاع چونکہ ریڈیو یا فون کے ذریعہ سے آئی ہے اس لیے چاند ہوا ہی نہیں۔

گویا ایک صحیح واقعہ اگر ان آلات کی معرفت معلوم ہو جائے تو وہ واقعہ واقعہ ہی نہیں ہوتا۔ اگر تار یا فون کی معرفت کسی کی موت یا پیدائش کی اطلاع آ جائے تو حضرت مولانا کے نزدیک یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ نہ

کوئی مرزا کوئی پیدا ہوا۔ ایسے عقلمندوں کا خدا حافظ۔

عید اور وحدتِ ملت

۲۹ ر رمضان کے ریڈیو سے معلوم ہوا کہ ڈھاکہ میں چاند نظر نہیں آیا لیکن کمشنر صاحب مشرقی پاکستان نے وہاں بھی عید کا اعلان کر دیا معلوم نہیں کیوں کیا گیا۔

بات یہ ہے کہ اختلافِ مطلع ایک حقیقت ہے۔ وحدتِ ملت کی دلیل صرف عید ہی کو تصور کرنا حقائق سے مطابقت نہیں۔ اگر ڈھاکہ میں عید اتوار کو ہو جاتی تو اس سے ملت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ موسمیات کے محکمہ سے ہی دریافت فرمایئے اگر ڈھاکہ کا مطلع مغربی پاکستان سے مختلف ہے تو ان لوگوں کو عید پر کیوں مجبور کیا جائے۔ کمشنر صاحب ہزاروں روزے تڑوانے یا گنے کا گناہ اپنے ذمہ کیوں لیں۔ یہ نہ شرعاً درست ہے نہ عقلاً۔ محکمہ موسمیات اس کا فتویٰ دے سکتا ہے۔ مسلمان عید اللہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان سب کا ایک دن عید منانا ممکن ہی نہیں۔ اور نہ یہ وحدت شرعاً مطلوب ہے۔ حجاز، مصر اور شام میں عید جمعہ کو ہوئی تو اس سے ملت کو کچھ نقصان نہیں۔ ڈھاکہ میں چاند نظر نہ آنے کی وجہ سے اگر عید اتوار کو ہو تو اس میں وحدتِ ملت کو کون سا نقصان پہنچ سکتا ہے بلکہ وحدتِ ملت اس میں ہے کہ ملت کے احکام اور قواعد کی صحیح پابندی کی جائے۔ دانشمندی یہ ہے کہ جب آئندہ ریکے متعلقہ میں چاند نظر نہیں آیا تو معاملہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ طے شدہ مسائل کے خلاف پبلک سے کچھ لینا حکومت کے وقار کا تقاضا ہرگز نہیں۔

الاعتصام: ۷ راپریل ۱۹۶۷ء

عائلی قوانین اور جمعیتِ اہلحدیث

مولانا محمد اسماعیل صاحب ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ اہلِ حدیث مغربی پاکستان کا وضاحتی بیان

عائلی سفارشات جمہور کی مخالفت کی وجہ سے اپنی نیند سو گئیں۔ اس وقت کی حکومت انہیں نافذ نہ کر سکی۔ فوجی انقلاب اور آرڈی ننس کے سایہ میں بعض ترمیمات کے ساتھ ان کو پھر زندگی ملی۔ ہمارے ملک کی آزاد منش مستورات بلکہ بکشوفات نے صدرِ مملکت سے مل کر دین پسند طبقے اور ملک کے شرفاء کی خواہشات

لہ ان سطور میں بعض علمائے کرام کی طرف سے دینی معاملات پر غور و فکر کا جو انداز سامنے آتا ہے وہ یقیناً ان حضرات کے شایانِ شان نہیں۔ لہٰذا اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھنے کے بعد علماء کو چاہیے کہ جدید احوال و ظروف میں مسائلِ دین کی تعبیر جس علم و تحقیق اور وسعتِ ظرف کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ تاکہ امتِ مسلمہ کی نگاہ میں ان کا اعتماد اور ان کے منصب کی افادیت برقرار رہ سکے۔

کے علی الرغم ملک میں انہیں نافذ کرایا اور جب تک مارشل لار ملک پر محیط رہا ان قوانین پہ بادلِ ناخواستہ عمل ہوتا رہا۔ مارشل لار ہٹ جانے کے بعد عائلی قوانین کا رائے عامہ سے پھر تصادم ہوا اور ملک کی سیاسی اور اقتدار کی حریف جماعتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور یہ ان کا حق تھا چنانچہ صوبائی اسمبلی نے ان کے واپس لینے کی سفارش کر دی اور اب بھی شاید کسی بڑے آدمی کے سہارے یہ قوانین اپنی زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ اس سہارے کی تلاش میں بھی ہماری ان بہنوں کی مساعی کا خاصا دخل ہے جن کی اصطلاح میں آزادی اور آوارگی دو مترادف اور ہم معنی لفظ ہیں۔

صنفِ نازک کے مصائب جہاں ان قوانین کے طریق نفاذ پہ ہمیں جائز اعتراض ہے وہاں عورتوں کے مصائب اور روزمرہ کے پیش آمدہ حوادث سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقتاً ہماری گھریلو زندگی میں خرابیاں ہیں۔ آوارہ مزاج اور بدکردار عورتوں کے ساتھ شریف اور پاکباز عورتیں بھی ان ناہموار حوادث کا شکار ہو رہی ہیں۔ ان کی دادرسی نہ کرنے کا یہ معنیٰ ہوگا کہ گندم کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ اقتدار کی حریف جماعتیں جس انداز سے تصادم کر رہی ہیں اس سے خطرہ ہے کہ مفید اور ضروری چیزیں بھی انتقام کی نذر ہو جائیں اور اگر ایسا ہوا تو یہ ایک سانحہ ہوگا۔

آج سے کئی سال پہلے ۱۹۳۹ء میں کاظمی بل اُس وقت کی بعض خرابیوں کی اصلاح کے لیے علمار کے مشورہ سے پاس ہوا تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ لکھی۔ اس کی بعض جزئیات میں انہوں نے فقہ شافعی، مالکی اور حنبلی سے استفادہ فرمایا کیونکہ فقہ حنفی ان حالات میں معاشرہ کی وقتی ضرورت کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔

انصاف پسند علمار نے ہمیشہ امت کے مصائب کو دردمندی کی نگاہ سے دیکھا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو تقلید کی پابندیوں کو توڑ کر انہوں نے وقت کی ضرورت کا ساتھ دیا۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کوشش اور کاظمی بل ارتداد کی کثرت کو روکنے کا ایک بنیادی اور اساسی ذریعہ تھے۔ اس بل کے پاس ہونے سے ملک میں ارتداد کی تعداد نفی کے برابر ہو گئی۔ اس وقت کی انگریزی حکومت نے بھی اسے منظور کر لیا اور یوں صلح و آشتی اور علمار کی دور اندیشی سے یہ مسئلہ ایک حد تک خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ کاظمی بل میں قاضی کے مسلمان ہونے کی شرط نہیں قبول کی گئی تھی جس پر بعض اہلِ علم مُصر تھے۔

پیشِ نظر قوانین میں بھی اقتدار سے ٹکرانے کے بجائے مناسب یہ ہے کہ اربابِ اقتدار اور ملک کے بہی خواہ معاشرہ کی اصلاح اور عائلی ضرورتوں اور نقائص کے متعلق سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان قوانین پہ نظرِ ثانی کریں۔ مفید چیزیں لے لی جائیں اور خلافِ شریعت قوانین نظر انداز کر دیے جائیں۔

اہلِ حدیث اور ان کا مزاج جماعتِ اہلحدیث چونکہ اقتدار کی حریف نہیں اس لیے انگریزی اقتدار کے سوا ہم نے کسی اقتدار کے ساتھ بطورِ حریف تصادم نہیں کیا۔ البتہ تاریخ بتاتی ہے کہ اہلِ حدیث ہر زمانہ میں ہر اقتدار کے نقاد ضرور رہے ہیں۔ اس راہ میں انہوں نے بڑی سے بڑی اذیت برداشت کر لی لیکن تنقید سے دست بردار نہیں ہوئے۔ آئمہ حدیث نے یہ فرض اس وقت بھی ادا کیا جب اقتدار کی زمام کافی حد تک امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہاتھ میں تھی اور اس وقت بھی ادا کیا جب اقتدار پر قبضہ مامون اور واثق کا تھا لیکن یہ اقتدار کے حریف کبھی نہیں بنے بلکہ شاہی درباروں سے کہیں دور بسیرا کیا۔ رحمہم اللہ

مسائل پر غور کرتے وقت بھی اہلِ حدیث کا مزاج یہ ہے کہ نہ وہ ازراہ ضد کسی چیز کو قبول کرتے ہیں نہ مسترد۔ مناسب یہی ہے کہ مسائلِ شرعیہ پر غور کرتے ہوئے سیاسی مصالح سے بالا ہو کر ادلۂ شرعیہ اور مصالحِ امت کی روشنی میں غور کیا جائے۔ انہوں نے جب آئمہ اسلام کی تقلید کو اپنا معمول قرار نہیں دیا تو سیاسی رقابت کو ذہن میں کیوں جگہ دی جائے۔ قاضی حفیظ اللہ کا مضمون میں نے دیکھا ہے وہ شاید کسی اخبار سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ویسے مودودی صاحب کی خواہش بھی تھی کہ مولانا غزنویؒ کے خلاف اہل حدیث حضرات لکھیں اور ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ قاضی احمد اللہ صاحب کے بعد یہ خاندان جماعتِ اسلامی سے ازبس متاثر ہے اور مسلک اہلِ حدیث سے بہت ہٹ چکا ہے۔

منکرینِ سنت جماعتِ اسلامی کے اخبارات نے طعن کے طور پر فرمایا ہے کہ عائلی قوانین کی حمایت منکرینِ سنت پرویزی کر رہے ہیں یا اہلِ حدیث۔ یہ طعن انصاف پسندی پر مبنی نہیں منکرینِ سنت قریباً ان قوانین کی پوری کھیپ کو مانتے ہیں جبکہ اہلِ حدیث نے ان میں سے صرف چند اشیاء کو پسند کیا ہے اور وہ بھی من وعن نہیں۔ ان میں بھی ہنوز ترمیم کی ضرورت ہے یہی مسلک اہلِ حدیث کا مزاج ہے وہ فرعی مسائل میں وہی چیزیں قبول کرتے ہیں جو سنت کے مطابق ہوں اور اوفق بالمصالح۔

جمعیۃ اہلحدیث کی قرار داد اس ضمن میں جو مضمون مولانا غزنوی کے قلم سے شائع ہوا ہے وہ جمعیۃ کی ایک قرار داد کا نتیجہ ہے۔ قرار داد میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ علماء کا ایک بورڈ عائلی قوانین پر غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے اس قرار داد پر بعض معزز رفقاء نے قانونی بحث کی ہے اور ظاہر فرمایا ہے کہ اس قرار داد کی قانونی نوک پلک درست نہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اگر یہ درست ہے تو اس پر بحث عاملہ یا شوریٰ میں ہونی چاہیے۔ اخبار کے صفحات اس کے لیے موزوں مقام نہیں اچھی اچھی مجالس میں دیکھا گیا ہے انتہائی کوشش کے باوجود قانونی خامیاں رہ جاتی ہیں۔

اس کا اصل علاج رفقاء کا اعتماد ہے اس باہمی اعتماد ہی کی بناء پر جماعتی نظم و نسق کا سفر اپنی آخری حد تک جاری رہ سکتا ہے۔ بورڈ کی میٹنگ کئی گھنٹے ہوتی رہی۔ اور پیشِ نظر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا اور اصحابِ فکر نے اپنے افکار سے مستفید فرمایا۔

جہاں تک میرا حافظہ میری مدد کرتا ہے بورڈ اس امر پر متفق تھا کہ ہماری راہ ان جماعتوں سے مختلف ہونی چاہیے جو حکومت کے ساتھ اقتدار کی حریف ہیں۔ ہمارے غور کا انداز سیاسی نہیں بلکہ علمی ہونا چاہیے۔ رجسٹریشن کے متعلق قریباً سب کا کہ اس میں کوئی خطرہ ہو تو اس کی ممکن اصلاح کے بعد رجسٹریشن کو قبول کر لینا چاہیے تعددِ ازدواج پر پابندی کے متعلق آراء مختلف تھیں۔ بعض احباب معاشرہ کی بے اعتدالیوں کو دیکھتے ہوئے اس حق میں تھے کہ پابندی عائد ہو جائے اور عورت کی مظلومیت کا تھوڑا بہت جو علاج ہو سکے ہو جانا چاہیے زیادہ تر یہی رجحان تھا لیکن بعض حضرات زیادہ دور اندیشی سے کام لے رہے تھے ان کا خیال تھا کہ موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ پر دین کے معاملہ میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ان کے توسط سے کوئی پابندی عائد نہیں ہونی چاہیے اربابِ اقتدار اسے حسبِ عادت غلط استعمال کریں گے اس کے علاوہ یہ طبقہ اسلام اور اس کی حدود سے قطعی ناآشنا ہے اور مطلق جاہل طلاق کے اثر کے لیے نوے دن کی قید لگا کر ان حضرات نے مضحکہ خیز لاعلمی کا ثبوت دیا ہے اس لیے ایسے اربابِ اقتدار کو دین کے متعلق کوئی اختیار تفویض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خطرہ کافی حد تک ہے بھی صحیح۔ لیکن خطرہ کہاں نہیں؟ سیاسیات، معاشیات، معاشرتی امور میں اربابِ اقتدار کی لاعلمی، بے اعتنائی خرابی کا موجب ہو رہی ہے۔ جب اقتدار ہے تو وہ اچھا یا برا اپنا کام کرے گا۔ اور موجودہ حالات میں مجبوری اقتدار کا واسطہ لینا ہی پڑے گا اس لیے جو ملتا ہے لے لینا چاہیے اور باقی کے لیے کوشش جاری رہنی چاہیے بغرض بورڈ کے ممبر تعددِ ازدواج کی خرابیوں پر متفق تھے اس کی اصلاح کے لیے اگر کچھ قیود عائد کی جائیں تو وہ اس کو بھی مانتے تھے۔ یعنی بیماری بھی نظر میں تھی اور اس کے علاج کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اختلاف اس میں تھا کہ طبیب کون ہو؟ موجودہ اقتدار کی مصالحانہ حیثیت سب کے نزدیک مشتبہ یا مشکوک ہے بلکہ یہ لوگ یقینی طور پر اس کے اہل نہیں لیکن بورڈ کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ جب دوسرا بہتر طبیب موجود نہیں تو جو موجود ہے اس سے بقدرِ ضرورت فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔

قرارداد کن راہوں سے آئی؟ اس کی آئینی حیثیت کیا ہے؟ اس پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس قرارداد کی روشنی میں بورڈ بنا۔ پھر دفتر کی دعوت پر یہ سب حضرات جمع ہوئے اور طویل غور و فکر کے بعد بورڈ کی اکثریت تعددِ ازدواج پر پابندی کے حق میں تھی۔ مسائل کے متعلق ووٹنگ کی کوئی حیثیت

نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ بالاتفاق طے ہو جائے تو اس کے متعلق بھی دیانتدارن سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے اس معاملہ میں کسی کو پابند کرنا درست نہیں اس لیے اس پہ ووٹ نہ ہوئے۔ لیکن بورڈ کی اکثریت پابندی کے حق میں نہ تھی اور چونکہ ابھی کچھ مباحث باقی تھے اس لیے ان پر بحث آئندہ میٹنگ تک ملتوی کر دی گئی۔ بعدازاں مولانا غزنوی علیل ہو گئے اور بورڈ کی میٹنگ نہ بلائی جا سکی۔ مولانا نے اچھا کیا اپنی طرف سے بیان دے دیا اس کے بعد بہتر تھا کہ بیان بازی کا سلسلہ شروع نہ ہوتا۔"

مولانا عطاءاللہ صاحب عائلی قوانین کے متعلق مولانا عطاء اللہ صاحب نے یہ پوزیشن اختیار فرمائی کہ عائلی قوانین کو بعض دوسری جماعتوں کی طرح کلیۃً مسترد کر دیا جائے اور اس سے کوئی چیز قبول نہ کی جائے۔ مولانا موجودہ ارباب اقتدار سے بالکل مایوس تھے وہ ان کی اصلاحات کو جزوی طور پر بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے یہ خطرہ یقیناً ہر دین پسند ذہن میں پایا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں کہ خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کیا جائے۔ اس میں کسی پر کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ہر آدمی کے سوچنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ وہ اسی طرح سوچتا ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا۔

مولانا ایک اور سبب سے بھی مجبور تھے جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے بیان میں فرمایا ہے۔ عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد مولانا مودودی صاحب نے مختلف علماء کی ایک میٹنگ بلائی تاکہ اجتماعی طور پر سوچا جائے۔ مولانا غزنوی سفر سے آئے تھے تھکاوٹ کی وجہ سے نہ جا سکے انہوں نے مولانا عطاء اللہ صاحب کو بھیج دیا اب یہاں دونوں حضرات کو مغالطہ ہوا۔ مولانا عطاء اللہ صاحب سمجھے کہ میری حیثیت نمائندہ کی ہے اس لیے انہوں نے وہاں دستخط فرماتے ہوئے صدر جمعیت اہل حدیث لاہور ارقام فرمایا۔ حضرت الامیر کا خیال ہے کہ مولانا کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دل کا حال تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے لیکن بظاہر یہ اجتہادی غلطی ہے جس کا سبب ایک دوسرے پر اعتماد ہے نہ مولانا نے دلوی عطاء اللہ صاحب کے حدود عمل کا تذکرہ فرمایا نہ مولانا عطاء اللہ صاحب نے اپنے موقف کی وضاحت طلب فرمائی۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ صورت حال کچھ بھی ہو مولانا عطاء اللہ صاحب نے جیسے فرمایا ہے کہ معاملہ پالیسی کا ہے اگر یہ درست ہے تو دستخط کرنے سے پہلے نہ صرف حضرت الامیر سے استصواب ضروری تھا بلکہ دوسرے رفقاء سے مشورہ بھی ضروری تھا۔ غیر مشروط تصدیق ہمارے جماعتی مزاج کے خلاف ہے ہم موجودہ نظام حکومت کے نقاد ہیں سیاسی حریف نہیں ہمارا موقف سیاسی سے زیادہ دینی ہے۔ ہماری سیاست بحمد اللہ دین کے تابع ہے دستخط کرنے کے بعد مولانا عطاء اللہ صاحب یہی راہ اختیار فرما سکتے

تھے جو انہوں نے اختیار فرمائی اس لیے کہ وہ رفقاء سے پہلے اپنا موقف متعین فرما چکے تھے تاہم یہ ایسا موقف تھا جس پر باقی ساتھی ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کے لہجے میں تکدر اور ناراضی کی بُو نہ ہوتی تو ان چند حروف کے لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

تعجب ہے ایک طرف تو مولانا عطاء اللہ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ عائلی قوانین کے متعلق جمعیۃ الحدیث نے کوئی پالیسی طے نہیں کی دوسری طرف اس کی تنسیخ کے مسودہ پر بغیر شرط دستخط کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنا سرکاری عہدہ (یعنی صدر جمعیۃ اہل حدیث شہر لاہور) تحریر فرماتے ہیں۔

اس کے برعکس مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی کا طرز عمل ملاحظہ ہو کہ باوجودیکہ بورڈ کی اکثریت اُن سے متفق تھی لیکن انہوں نے اپنے نام سے مضمون شائع کیا اور اپنی سرکاری حیثیت استعمال نہیں فرمائی۔

صحیح طریق کار اب بھی مناسب یہ ہے کہ حکومت ان قوانین میں یا تو ترمیم کر دے یا انہیں من وعن واپس لے لے اور مستند علماء کو جمع کر کے معاملہ ان کے سپرد کر دے اور چند وکلاء یا معاملہ فہم حضرات کو ان کے ساتھ کر دے اور ان کی سفارشات افہام و تفہیم کے بعد قبول کر لی جائیں ایسے معاملات میں خود پسندی اور استکبار نہ حکومت کے لیے مفید ہے نہ علماء اور اصحاب فکر کے لیے۔

اصل مسئلہ رہا اصل مسئلہ تو اس پر بہرحال غور کرنا ہوگا۔ اس راہ میں عدل کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر سورۂ البقرہ، صفحہ ۵۰۸ میں حضرت عمرؓ کا ارشاد جو کتابیات کے ساتھ نکاح سے روکنے کے متعلق ہے قریباً تین اسانید سے ذکر فرمایا ہے اور ان میں سے ایک سند کو صحیح قرار دیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تفسیری اور اخباری اسانید آئمہ حدیث کے پایہ کی نہیں ہو سکتیں۔ اسانید کی نوعیت کچھ بھی ہو واقعہ یوں ہے۔ حضرت حذیفہؓ اور طلحہ بن عبید اللہ نے بھی کسی کتابیہ سے نکاح کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو ان دونوں بزرگوں کے متعلق اطلاع ملی آپ سخت ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ عورتیں ان سے علیحدہ کر دی جائیں۔ آپ کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ عادت چل نکلی تو مسلمان لڑکیوں کے لیے دقت پیدا ہو جائے گی۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

وانما کرہ لطلحۃ وحذیفۃ رحمۃ اللہ علیہم نکاح الیہودیۃ والنصرانیۃ حذرا من ان یقتدی بہما الناس فی ذالک فیزھدوا فی	حضرت حذیفہؓ اور حضرت طلحہؓ کو کتابیات کے ساتھ اس لیے روکا تھا کہ مسلمان ان کی تقلید میں کہ کتابیات کے ساتھ نکاح شروع کر دیں تو مسلمان

المسلمات او لغیر ذٰلك من المعانی فامرھا بتخلیتھا۔ (ابنِ جریر ص۲۲۲ ج ۲)

عورتوں سے بے رغبتی ہو جائے گی۔ یا کسی دوسرے سبب سے آپ نے انہیں روکا اور کتابیات کو الگ کرنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد حضرت شقیق سے بسند نقل فرمایا کہ حضرت حذیفہ نے یہودیہ سے نکاح کیا تو حضرت عمرؓ نے علیحدگی کا حکم دے دیا۔ حضرت حذیفہ نے پوچھا کیا یہ نکاح حرام ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا حرام نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم ان کی بجائے مسلمان عورتوں سے نکاح کرو۔

اس کے بعد ابنِ جریر فرماتے ہیں۔

ھذا الخبر وان کان فی اسنادہ مافیہ فالقول لاجماع الجمیع علی صحۃ القول بہ اولیٰ من خبر عبد الحمید بن بھرام۔ (ابنِ جریر ص۲۲۳ ج۲)

اس حدیث کی سند میں گو ضعف ہے لیکن اجماع اس پر ہے کہ کتابیات سے نکاح درست ہے لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کتابیات کو مسلمان عورتوں پر ترجیح دی جائے۔

اسناد کے مباحث اپنی جگہ لیکن یہ واقعہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو جو بعض روایات میں مذکور ہے یا اس کے سوا کوئی اور وجہ ہو بہرکیف حضرت عمرؓ نے حلال سمجھتے ہوئے اس میں مداخلت فرمائی اور اس سے روکا۔

سوید بن غفلہ، ابو حنظلہ مکی اور عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے ابی جہل کی لڑکی کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا اس کی اجازت نہیں فاطمہ میری لختِ جگر ہے۔ اس کی ایذا میری ایذاء ہے۔ (مستدرک حاکم ص۱۵۸ ج ۳)

بعض روایات میں اس طرح آیا ہے۔

لا احرم ما احل اللہ

میں حلال کو حرام نہیں کرتا۔

لیکن اللہ کے رسول کی لڑکی اللہ کے رسول کے دشمن کی لڑکی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

اس حدیث سے دوسرے نکاح میں رکاوٹ سمجھ میں آتی ہے حلال بھی سمجھا لیکن اجازت مرحمت نہیں فرمائی۔ یہ حدیث بھی صحیح ہے اور معاملہ بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا ہے خواہش مند حضرت علیؓ ہیں مگر اجازت نہیں ملی۔

حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں حضرت علی نے پھر دوسری شادی کا خیال نہیں فرمایا حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد کئی نکاح کیے اور اولاد بھی ہوئی۔

حکومت کے اختیارات اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کسی جائز اور مباح امر کو بعض مقاصد یا مصالح کی بنا پر حکومت روک سکتی ہے یا نہیں۔ یہ دراصل آئینی یا نظریاتی بحث ہے آئینی جماعتیں ان نظریات پر بحث کر سکتی ہیں لیکن عملاً اس چیز کا کوئی اثر نہیں۔ با اختیار لوگ اپنا کام کرتے ہیں اور نظریات پر بحث ہوتی رہتی ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ موجودہ اربابِ اقتدار واقعی اس کے اہل نہیں کہ ان پر دین کے معاملہ میں اعتماد کیا جائے۔ لیکن مسئلہ کی صورت میں یہی مناسب ہے کہ معاشرہ کی بے اعتدالیوں کو ختم کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اصلاحات کو بروئے کار لایا جائے تاکہ اس مظلوم طبقہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انصاف ہو سکے۔ بنا بریں ہمارے خیال میں حکومت کی بے اعتدالیوں پر تنقید کے ساتھ ساتھ یکے بگیر و دیگرے را دعوی کن کے مطابق عمل مفید رہے گا۔

الاعتصام : ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

صحاح ستہ کے مؤلفین کے بارے میں ایک سوال ـــــ دو جواب

محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب ناگی نے جولائی ۵۸ء کے طلوعِ اسلام میں صحاح ستہ کے متعلق ایک تاریخی سوال شائع فرمایا ہے۔ بعینہ یہ سوال تقریباً ۷۹۹ھ میں علامہ ابنِ خلدون کے ذہن میں کھٹکا۔ مولانا کے لیے محرک وہ فضا ہے جو اہلِ قرآن حضرات نے احادیثِ نبویہ اور محدثین کے متعلق پیدا کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ صحاح ستہ کے مؤلفین ائمہ حدیث فارسی الاصل عجمی ہیں ان میں نسلاً کوئی عربی نہیں۔ مولانا دریافت فرماتے ہیں کہ عرب اس خدمت سے کیوں محروم رہے؟ عربی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تدوین کا شرف عجمیوں کو کیوں ملا؟ (مختصراً)

منکرینِ حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ اسلام کی تخریب کے لیے عجمیوں نے سازش کی اور احادیث بنا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیں۔ گویا مصنفینِ صحاح اسلام کے مخالف تھے۔ ان کے خیال میں فنِ حدیث کی تدوین سے اسلام کو نقصان پہنچانا مقصود تھا اور عجمی اس سازش میں صدیوں کامیاب رہے اور پونے گیارہ سو سال تک مسلمان اس سازش کو نہ سمجھ سکے بلکہ اسے دین کی خدمت سمجھتے رہے۔

ابنِ خلدون نے اس سوال کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے۔

ومن الغريب الواقع ان حملة العلم فى الملة الاسلامية اكثرهم العجم لا من العلوم الشرعية

یہ عجیب واقعہ ہے کہ اسلام میں شرعی اور عقلی علوم کے جاننے والے زیادہ تر عجمی ہیں اگر شاذ و نادر ان میں نسباً

ولا من العلوم العقلیۃ الا فی القلیل النادر وان کان منھم العربی فی نسبتہ فھو عجمی فی لغتہ ومرباہ ومشیختہ مع ان الملۃ عربیۃ و صاحب شریعتھا عربی (مقدمہ ابن خلدون الفصل الخامس والثلاثون)

کوئی عربی ہے تو لغت، تربیت اور تعلیم کے لحاظ سے وہ بھی عجمی ہے حالانکہ دین عربی ہے۔ اور صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عربی ہیں۔

ابنِ خلدون فرماتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ میں ابتداءً... صنعت اور حرفت نہ تھی اس وقت کی سادگی اور بدویت کا یہی تقاضا تھا کہ شرعی احکام اور اوامر و نواہی کو لوگ حفظ کرتے تھے اور کتاب و سنت سے ان کے ماخذ کو جانتے تھے کیونکہ انھوں نے اسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے براہ راست سنا اور سمجھا تھا یہ لوگ عرب تھے اور تعلیم، تصنیف و تالیف اور تدوینِ علوم سے قطعی ناواقف تھے اور ان حروف و اسوال میں ان کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی یہ حالت صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانہ تک جاری رہی۔

نقل کا زمانہ

جب نقل کا زمانہ دور ہوتا گیا تو علوم کو مقید اور محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ تقریباً ۱۹۳ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے انتقال کا زمانہ ہے اس کے بعد تفاسیر کی تصنیف، دواوینِ سنت کی تدوین شروع ہوئی تاکہ یہ منقول سرمایہ ضائع نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسانید کی پہچان کے لیے علمِ جرح و تعدیل کی بنیاد رکھی گئی تاکہ اس منقول سرمایہ کی صحت اور سقم کو معلوم کیا جاسکے۔ جب نئے نئے واقعات رونما ہوئے تو استخراجِ احکام اور ان کے لیے اصول اور قواعد کی تشکیل ضروری سمجھی گئی تاکہ کتاب و سنت کے ساتھ ان فقہیات کا تعلق قائم رہے۔ عجمی اختلاط کی وجہ سے زبان بگڑنے لگی تو علمِ نحو ایجاد کیا گیا۔ فسادِ عقائد کی اصلاح کے لیے علمِ کلام کی تدوین ہوئی اور یہ علوم بتدریج ارتقائی منازل طے کرتے رہے اور مزید علومِ ادبیہ کی ضرورت بڑھتی گئی۔ اس طرح ان علوم نے صنعت اور ملکہ کی صورت اختیار کرلی اور صرف سماع اور نقل کے بجائے یہ علوم فن اور صنعت قرار پائے۔ اور معلوم ہے کہ یہ ساری چیزیں حضریت کے لوازم میں سے ہیں بدویت اور سادگی ان تکلفات کی متحمل نہیں ہوتی اور عربوں کا مزاج ان تکلفات سے طبعاً دور تھا۔

ان ایام میں حضریت موالی اور عجمیوں کے حصے میں آئی اور اس وقت کی شہریت، علوم اور عادات میں عجمیوں کی غلام اور دست نگر تھی اور صنعت اور حرفت میں وہ انہیں کے تابع تھے فارس حکومت ہی سے ان میں حضریت اور شہریت کی عادات راسخ ہوئی تھی چنانچہ ائمہ نحو سیبویہ، ابو علی فارسی اور زجاج تمام کے تمام نسباً عجمی تھے ان لوگوں نے عربی زبان عربوں سے سیکھی لیکن اس کے قواعد و ضوابط منضبط فرمائے آنے والی نسل

کے لیے ایک فن بنا دیا

اسی طرح آئمہ حدیث کی اکثریت عجمی تھی یا مستعجم۔ ابنِ خلدون فرماتے ہیں۔

وکذا حملۃ الحدیث الذین حفظوہ عن اھل الاسلام اکثرھم عجم او مستعجمون باللغۃ والمربی وکان علماء اصول الفقہ کلھم عجما کما یعرف وکذا حملۃ علم الکلام وکذا اکثر المفسرین ولم یقم بحفظ العلم وتدوینہ الا الاعاجم۔ (مقدمہ ص۵)

اسی طرح آئمہ حدیث اکثر عجمی تھے یا لغت اور رہائش کے لحاظ سے مستعجم تھے۔ اور علماء اصول فقہ بھی کلہم عجمی تھے نیز آئمہ علم کلام بھی سب کے سب عجمی تھے۔ اسی طرح اکثر آئمہ تفسیر عجمی تھے۔ غرض علوم کے حفظ و تدوین میں عجمی حضرات کے سوا کوئی آگے نہیں آیا۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی پوری طرح سچی ہوگئی کہ :

"اگر علم آسمان کے کناروں سے بھی متعلق ہو تو اہلِ فارس اس پر قابض ہو جائیں گے۔" اور حسب ارشاد مولانا ناگی علم کی دنیا میں عجمیہ کا جال بچھ گیا اس کے بعد فرماتے ہیں۔

اما العرب الذین ادرکوا ھذہ الحضارۃ وسوقھا وخرجوا الیھا عن البداوۃ ..... فشغلتھم الریاسۃ فی الدولۃ وحامیتھا واولی سیاستھا مع ما یلحقھم من الانفۃ عن انتحال العلم حینئذ بما صار من جملۃ الصنائع۔ (مقدمہ حوالہ مذکورہ)

عربوں سے جن لوگوں نے عباسی دور میں اس حضریت اور شہریت کو پایا اور بدویت کو چھوڑا وہ آنے ہی ریاست کی ذمہ داریوں میں پھنس گئے اور سیاسی مشاغل کی وجہ سے علم و دانش کا مشغلہ اختیار نہ فرما سکے دلیے بھی رئیس اور سردار صنعت و حرفت اور مشقت سے نفرت کرتے ہیں

البتہ عجمی اہلِ علم کی یہ لوگ عزت کرتے رہے کیونکہ وہ علمِ دین کے حامل اور خادم تھے۔ اور آخر میں فرمایا۔

فھذا الذی قررناہ ھو السبب فی ان حملۃ الشریعۃ او عامتھم من العجم (حوالہ مذکورہ)

ہماری اس تقریر سے ظاہر ہے کہ حاملین شریعت عام طور پر عجمی تھے اسی طرح عقلی علوم بھی زیادہ تر عجمیوں میں ہی رہے اور جب تک اہلِ عجم میں حضریت موجود رہی وہ عقلی اور نقلی علوم کی خدمت کرتے رہے جب عجمیوں میں بدویت آگئی اور حضریت نے ان کو جواب دے دیا تو ان سے بھی بالکلیہ علم جاتا رہا اور علم ان شہروں میں چلا گیا جہاں حضریت پائی جاتی تھی جیسے مصر، یہ حضریت کے لحاظ سے آج کل دنیا کی جڑ ہے ماوراء النہر میں تھوڑی سی حضریت موجود ہے لہٰذا وہاں بھی علوم کی خدمت کا جذبہ موجود ہے۔

چنانچہ علامہ سعد الدین تفتازانی کے سوا یہیں وہاں کسی محقق عالم کی اطلاع نہیں ملی اھ (مقدمہ ابن خلدون حوالہ مذکورہ)

مولانا ناگی اور اہلِ قرآن حضرات سے دونوں جواب آپ کے سامنے ہیں مقدمہ ابنِ خلدون کا میں نے آزاد ترجمہ کیا ہے مناسب ہوگا آپ حضرات اصل کتاب پر بھی ایک نظر ڈال لیں اسی سے علم اور جہل کا فرق واضح ہو جائے گا اور آپ محسوس فرمالیں گے کہ علم کی ذمہ داریاں کس قدر گراں ہیں اور لاعلمی کتنی جلدی آوارگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

۱۔ ابنِ خلدون نے تاریخ سازی نہیں کی بلکہ ثابت شدہ حوادث اور واقعات میں تطبیق دی ہے۔

۲۔ اس میں سلف کا اعزاز اور امت کے جذبات کا تشکر یہ آمیز اعتراف ہے۔

۳۔ ملوکِ عرب کی طرف سے معذرت ہے اور قدرتی تقسیمِ کار کا اظہار۔

۴۔ اس سے علوم خصوصاً علمِ حدیث کا تدریجی اور طبقی ارتقاء معلوم ہوتا ہے اور اہلِ علم کا خلوص۔

دوسرے جواب کے متعلق میرا احساس حضرات اہلِ قرآن کے جواب کے متعلق میرے احساسات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اس میں کوئی علمی یا تاریخی نقطہ نہیں۔

۲۔ ایک سلبی واہمہ ہے جسے قرینہ کہنا بھی مشکل ہے البتہ شبہ کہا جاسکتا ہے۔

۳۔ اس جواب کا انداز یہ ہے جیسے ایک شریر الطبع لیکن کمزور لڑکا اپنی آبرو سے بے نیاز ہو کر ساتھیوں کو چھیڑنا شروع کر دیتا ہے اور جب رفقاء کے حملوں کی مدافعت نہیں کر سکتا تو ——— شور، ہنگامے اور بدزبانی سے اس کسر کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ شاید کوئی ناواقف اس کا ہمدرد بن جائے۔

علم اور عقل کی دنیا میں غالباً آپ کا کوئی غمگسار نہیں۔ حدیث پر آپ حضرات کے شبہات کی بنا قلتِ علم اور قلتِ مطالعہ پر ہے ادارۂ طلوعِ اسلام کے اندازِ فکر نے تحریک کو اور بھی عامیانہ اور علم و فکر کی حدود سے بہت دور ڈال دیا ہے اب غوغا آرائی کے سوا علمی ذوق اور فکری پیاس کے لیے اس پورے ادارہ کے پاس کچھ نہیں۔

یہ گزارش جناب سے مخلصانہ مراسم کی بنا پر کی ہے مجھے امید ہے کہ میرے اس اندازِ جسارت کو جناب میرے اخلاص پر مبنی سمجھیں گے۔

میرا خیال تھا کہ جناب عمر کا آخری حصہ قرآن و سنت کی خدمت میں صرف فرماتے شاید پہلی عمر کی لغزشوں کا کفارہ ہو جاتا ——— مگر افسوس ہے کہ آپ کے مطالعہ کا رُخ بے حد غلط سمت اختیار کر گیا ہے۔

اور آپ بڑے غلط ماحول میں گرفتار ہو گئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی گلو خلاصی کا سامان پیدا کر دے اور آخر عمر میں آپ سے دین کی کوئی خدمت لے تاکہ آپ کا حشر قیامت کے دن اپنے اکابر کے ساتھ ہو جو بحمد اللہ کتاب و سنت کے پابند تھے ۔

الاعتصام : ۲۲ راگست ۱۹۵۷ء

اختلاف اور حدود ادب

امام ابو یوسفؒ کا اندازِ بحث

خلیفہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے کچھ مسائل دریافت کیے حضرت امام رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا وہ "کتاب الخراج" کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے ۔ یہ جوابات تقریباً اڑھائی سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اُس زمانہ کے مالی نظام کا بہت حد تک تعارف اس کتاب کی بدولت ہو جاتا ہے اور حضرت امام کی دفتری نظر کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے ۔

امام ابو یوسفؒ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک دونوں سے علم حاصل کیا ہے چنانچہ انکے مسلک میں دونوں کے طریقِ فکر کی جھلک ہے وہ امام ابو حنیفہؒ سے بڑی متانت سے اختلاف فرماتے ہیں اور اُن کے مسلک پر بعض جگہ کڑی تنقید بھی کرتے ہیں ۔ انہوں نے مسلک کی صحت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے لیکن دامنِ ادب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔

(۱) غنیمت کی تقسیم کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر میں گھوڑے کے لیے دو حصے عطا فرمائے اور پیدل لڑنے والوں کو ایک ایک حصہ دیا ۔

اسی طرح حضرت ابو ذر سے مروی ہے ۔

شہدت انا واخی مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنینا ومعنا فرسان لنا فضرب لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ستۃ اسہم اربعۃ لفرسینا وسہمین لنا ۔

یعنی ہم دونوں بھائی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حنین کی لڑائی میں شریک ہوئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں چھ حصے عنایت فرمائے دو دو گھوڑوں کے اور ایک ایک ہمارا اپنا حصہ ۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک اس کے خلاف ہے وہ فرماتے ہیں جانور کو آدمی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی اس لیے گھوڑے اور آدمی کو برابر برابر حصہ ملے گا اس عقلی دلیل کے ساتھ وہ ایک اثر سے بھی استدلال فرماتے ہیں کہ شام کی کسی جنگ میں حضرت عمرؓ کے کسی عامل (کارندہ) نے گھوڑے اور مجاہد کو برابر کا حصہ دیا

اور حضرت عمرؓ نے اسے قبول فرمایا۔ فرماتے ہیں۔

قال ابو یوسف کان الفقیہ المقدام ابو حنیفۃؒ یقول للرجل سہم و للفرس سہم و قال لا افضل بھیمۃ علی رجل مسلم و یحتج بما حدثنا لا بعض الاسناد، عن المنذر بن ابی خبیصۃ الھمدانی ان عاملا لعمر بن الخطاب قسم فی بعض الشام للفارس سہم و للرجل سہم فرفع ذلک الی عمر فسلمہ و اجازہ (الخراج صـ۲۲)

حضرت امام کے لیے فقیہ مقدم کا لفظ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے خطابات کی بھرمار بھی نہیں فرمائی اور شیخ کے مقام کی رفعت کو نظر انداز نہیں کیا۔ رحمہ اللہ و رضی عنہما ما احسن و ادق فی العلوم افکارھم۔

حضرت امام ابو یوسفؒ امام صاحبؒ کے اس استدلال سے مطمئن نہیں ہیں اس لیے وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی دلیل کے ہر پہلو پر گفتگو فرماتے ہیں ارشاد ہے۔

و ما جاء من الاحادیث و الآثار ان للفرس سہمین و للرجل سہم اکثر من ذلک و اوثق و العامۃ علیہ و لیس ھذا علی وجہ التفضیل و لو کان علی وجہ التفضیل ما کان ینبغی ان یکون للفرس سہم و للرجل سہم لانہ قد سوی بھیمۃ برجل مسلم انما ھذا علی ان یکون الرجل اکثر من عدۃ الآخر و لیرغب الناس فی ارتباط الخیل فی سبیل اللہ الا تری ان سہم الفرس یرد علی صاحب الفرس فلا یکون للفرس دونہ و المتطوع و صاحب الدیوان فی القسمۃ سواء اھ (الخراج صـ۲۲)

(۱) جن احادیث میں گھوڑے کے دو حصے اور مجاہد کے ایک حصے کا ذکر ہے وہ صحیح بھی ہیں اور زیادہ بھی۔

(۲) جمہور کا بھی یہی مسلک ہے (یعنی شیخ محترم منفرد ہیں)

(۳) اور یہ تقسیم اظہار فضیلت کے لیے نہیں ورنہ ایک مسلمان کا گھوڑے کے برابر ہونا بھی توہین سے خالی نہیں۔

(۴) اصل مقصد یہ ہے کہ جنگ کی تیاری ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کی جائے تاکہ اس میں آخرت کے علاوہ دنیوی فائدہ بھی ہو۔

(۵) اور لوگ گھوڑوں کی پرورش پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے سکیں۔

(۶) گھوڑے کا حصہ بھی گھوڑے کو نہیں دیا جاتا جو کچھ گھوڑے کو ملے گا وہ بھی تو مالک ہی کو ملے گا۔

(۷) رضاکار اور عمالِ حکومت تقسیم میں برابر ہیں اس لیے فضیلت کی بحث برمحل نہیں۔ امیر المومنین جس قول پر چاہے عمل کرے اور جسے عامۃ المسلمین کے لیے مفید سمجھے اسے قانونی صورت دے دے۔

قابلِ غور معاملہ یہ ہے کہ بحث میں نہ تو طنز ہوا ہے اور نہ ہی ذاتیات کا ذکر، حضرت الامام کے مسلک کے تمام پہلوؤں پر شاگرد رشید نے تنقیدی نظر فرمائی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی پہلو بھی سلامت نہیں رہا لیکن غیر سنجیدہ ایک لفظ بھی زبان پر نہیں آیا۔ دوسری طرف ہمارا یہ طریق بحث معلوم نہیں کب سے شروع ہوا ہے کہ پوری بحث ذاتیات میں الجھی رہتی ہے اور ذاتی عداوت کے ساتھ ایک نئی مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے بڑے اور چھوٹے ایک ہی مرض کے مریض ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ!

(۲) زمین کی بٹائی کے متعلق اہلِ علم میں اختلاف ہے اہلِ حجاز اور اہلِ مدینہ سفید زمین کا بٹائی پر دینا مکروہ سمجھتے ہیں لیکن اگر زمین میں کچھ کھجوریں اور درخت ہوں اور ان درختوں کے ساتھ سفید زمین بھی ہو جس میں کھیتی ہو سکے تو اسے بٹائی پر دینا جائز سمجھتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ سفید زمین اور درختوں کے ساتھ ملحقہ زمین دونوں میں بٹائی ناپسند فرماتے ہیں اور ابن ابی لیلیٰ دونوں صورتوں کو جائز اور درست سمجھتے ہیں۔

حضرت امام اسے اجارہ فاسدہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک ثلث (تہائی) اور ربع (چوتھائی) سے اجرت کی مقدار کا تعین نہیں ہوتا اور اجرت مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہوتا ہے ہو سکتا ہے کہ چوتھائی یا تہائی حصہ میں مزدور کو غلہ کی اتنی تھوڑی مقدار ملے جو اس کی محنت کا صحیح معاوضہ نہ ہو اور مزدور نقصان میں رہے یہ قطعی غلط ہے کہ حضرت امام رحمہ اللہ زمین کی ملکیت ہی کے منکر ہیں یہی زمین اگر نقد روپیہ پر دے دی جائے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ اس سے شرح اجرت کا تعین ہو جاتا ہے اور مزدور کا نفع نقصان واضح ہو جاتا ہے۔

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس مسئلہ میں شافعی (اہلِ حجاز) اور امام ابوحنیفہؒ (اہل کوفہ) دونوں سے اختلاف رکھتے ہیں وہ اس مسئلہ میں اہلِ حدیث اور امام ابن ابی لیلیٰؒ کے ہمنوا ہیں موصوف حضرت امام کے دلائل پر متانت سے بحث فرماتے ہیں ارشاد ہوتا ہے: (الخراج ص ۱۰۵)

فاحسن ما سمعنا فی ذلك ان ذلك كل جائز مستقيم صحيح وهو عندى مثل مال المضاربة قد يدفع الرجل الى الرجل المال مضاربة بالنصف والثلث فيجوز وهذا مجهول لا يعلم ما مبلغ ربحه وليس فيه اختلاف بين العلماء فيما علمت وكذلك الارض عندی بمنزلة مضاربة الارض البيضاء منها والنخل والشجر سواء اھ

صحیح یہ ہے کہ بٹائی کی دونوں صورتیں بالکل صحیح اور درست ہیں اس کی نظیر مضاربت ہے ایک شخص دوسرے شخص کو مال دیتا ہے کہ وہ کام کرے منفعت کا نصف یا ثلث اس سے طے پا جاتا ہے یہ مضاربت باتفاق ائمہ درست ہے حالانکہ اس میں نفع مجہول ہے۔ ثلث یا نصف میں کس قدر فائدہ حاصل ہوگا اس کی مقدار معلوم نہیں زمین کی بٹائی کا بھی یہی حال ہے سفید زمین ہو یا باغ حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں برابر ہیں اور درست۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف ہے وجہ اختلاف کا اظہار فرماتے ہوئے شاگرد رشید نے حد درجہ ادب کو ملحوظ رکھا ہے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استدلال میں جو نقص تھا اسے واضح کیا ہے، لیکن طنز و تشنیع سے بالکلیہ دور رہے ہیں۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ

تقلید یا ترک تقلید

ہمارے ملک میں تقلید اور ترک تقلید کی بحث تقریباً ایک صدی سے جاری ہے فریقین نے باہمی مناظرات میں سینکڑوں اوراق لکھ ڈالے ہیں باہمی مقدمات میں ہزاروں روپے صرف ہو گئے ہیں، مگر حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اہلحدیث کی یہ خواہش ہے کہ ائمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ارشادات اور رفتار ہی کو استشہاد میں وہ مقام نہ دیا جائے کہ اس پر مزید بحث کی گنجائش نہ رہے بلکہ ان کو وقتی تقاضوں کی حیثیت دی جائے اور ابدی تعلیم اور دائمی استناد کی حیثیت صرف وحی یعنی قرآن عزیز اور سنت نبوی کو ہی حاصل ہونی چاہیے۔

ائمہ اسلام کا علم طریق فہم میں معاون ہو سکتا ہے اور وقت کے تقاضوں اور ان کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ ان بزرگوں کی حیثیت اساتذہ کی سی ہے اور ان کے علوم بلاشبہ ہمیں رہنمائی دے سکتے ہیں۔ ان کے اختلافات سے ان وقتی تقاضوں کی اہمیت معلوم کی جا سکتی ہے، جس کی بنا پر ان بزرگوں کو اختلافات کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس قسم کے تقاضوں کی بنا پر اگر آج بھی اہل علم باہم یا ائمہ متقدمین سے اختلاف کریں تو ان کو اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

لیکن اس ضمن میں ایک عجیب لغزش ہوئی ائمہ کی محبت اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی الفت نے مخالفین پر طعن کے لیے راہ کھول دی اور ایک دوسرے کے علم و فہم پر حملے ہونے لگے احناف نے امام شافعیؒ کے علم و فضل کے متعلق ایسے الفاظ استعمال فرمائے جو حضرت امام شافعیؒ کے مقام کے لحاظ سے قطعاً نامناسب تھے۔ اسی طرح حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے علم و فضل پر دوسری جانب سے حرف گیری کی گئی جس سے امام رحمہ اللہ کا مقام کہیں بلند تھا، موالک اور حنابلہ میں بھی بعض اہل علم اس حرف گیری سے نہ بچ سکے اس غلط روی کی مثالیں کتب اصول فقہ سے بکثرت مل سکتی ہیں۔ اہل حدیث نے اسی بے اعتدالی کی بنا پر ترک تقلید

کی دعوت دی تاکہ محبت میں غلو دوسرے آئمہ کے متعلق بدظنی کا سبب نہ بنے ایک امام یا بزرگ سے دلی تعلق یا ربط اس حد تک نہ پہنچے جس سے دوسرے بزرگ یا امام سے بدگمانی پیدا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ علاج خود مرض کی صورت اختیار کر گیا اور آئمہ کے اجتہادی مسائل کو اغلاط تصور کیا گیا۔ ان کے علم حدیث پر دل خراش عنوان قائم کرکے بعض حضرات نے بالکل وہی صورت پیدا کر دی ہے جس سے بچنے کے لیے ترکِ تقلید کا نسخہ تجویز کیا گیا تھا کسی نے (الجرح علی البخاری) لکھ کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک خالص علمی مشغلہ یکایک انتقامی جنگ کی صورت اختیار کر گیا۔ اور رنگ دل آئمہ ہماری باہمی کدورتوں کا تختۂ مشق بن گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور یہ روش زمانہ کے ہزارہا تھپیڑوں کے باوجود ختم نہیں ہوئی

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے تحقیقی ارشادات ہم ایسے طالب علموں کے لیے بہترین رہنما ہیں اگر بحث نفسِ مسئلہ تک محدود رہے اور تنقید کی گرفت دلائل سے آگے نہ بڑھے تو میں سمجھتا ہوں کہ بحث میں تلخی پیدا نہیں ہو سکتی بحث کی یہی ایک صورت ہے جو دلوں تک رسائی حاصل کر سکتی ہے آئمہ سلف سے حضرت امام ابو یوسف رحؒ کے یہ ارشادات بہترین علمی نمونہ ہیں۔ رحمہ اللہ و رضی عنہ و ارضاہ

امام کا اندازِ خطاب حضرت امام ابو یوسفؒ کا شتکاری کی بحث کا آغاز فرماتے ہوئے اپنے دونوں مخالفین (شوافع اور احناف) کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

قال اصحابنا من اهل الحجاز واهل المدینة علی کراهة ذلك وافساده (الخراج ص۱۰۵) یعنی ہمارے حجازی رفقاء سفید زمین کے اجارہ کو پسند نہیں فرماتے بلکہ اسے فاسد سمجھتے ہیں واما اصحابنا من اهل الکوفة فاختلفوا فی ذلك اور ہمارے کوفہ کے رفقاء اس معاملہ میں حجازیوں سے مختلف ہیں وہ سفید زمین اور باغ کے جواز اور عدم جواز کی ایک ہی حیثیت میں رکھتے ہیں، اختلافی مسائل کی تحقیق میں اپنے دونوں مخالفوں کے لیے " اصحابنا " کا خطاب کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے یہ لفظ دلی صفائی کا کتنا بہترین ترجمان ہے۔ کاش ہم لوگ جب ان بزرگوں کے علم سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ تو ان کے اخلاق سے بھی بہرہ مند ہونے کی کوشش کریں۔

اپنی رائے کے اظہار میں جس سادگی کا اظہار فرمایا ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔

قال ابو یوسف فکان احسن ما سمعنا فی ذلك و اللہ اعلم ان ذلك جائز مستقیم اتبعنا الاحادیث التی جاءت من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی مساقاة خیبر لانها اوثق عندنا و اکثر و اعم مما جاء فی خلافها من الاحادیث (الخراج ص۱۰۶)

ہمارے نزدیک سفید زمین اور باغ دونوں کا بٹائی (ثلث یا نصف) پر دینا درست ہے کیونکہ خیبر کی

زمین اور اس کی بٹائی کے متعلق جو احادیث آئی ہیں صحیح اور زیادہ عام ہیں اور اس کے خلاف جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ صحت، کثرت اور عموم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے جوازِ اجارہ میں عموم کر ترجیح ہے۔ الخ

دلائل کی ترجیح میں مخالفین پر طعن تو کہیں رہا ان کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی حضرت امام ابو یوسفؒ کے اس اسوہ سے اہلِ حدیث اور احناف دونوں کو خصوصاً اور دوسرے اہلِ علم کو عموماً سبق حاصل کرنا چاہیے۔

(۳) زکوٰۃ اور غیر مسلم اگر کسی غیر مسلم ایسی زمین خریدے جس پر عشر واجب ہے تو حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اب اس پر عشر کی جگہ خراج واجب ہوگا اور یہ خراج اس سے بدلا نہیں جائے گا۔ گو وہ مسلمان ہی سے کیوں نہ خریدی گئی ہو یعنی حضرت امام کے نزدیک خراجی زمین مسلمان کے قبضہ میں بھی آجائے تو وہ عُشری نہیں ہو گی اس کا معاملہ زکوٰۃ کی صورت میں نہیں لیا جائے گا بلکہ خراج کی صورت میں لیا جائے گا اس کے برعکس حضرت حسن بصریؒ اور عطاءؒ کا مذہب یہ ہے کہ جب تک یہ زمین غیر مسلم کے قبضہ میں ہو گی اس پر عشر سے دوگنا رقم عاید ہو گی اور یہی اس کا خراج ہو گا لیکن جب یہ زمین مسلمان خریدے یا اس کا غیر مسلم مالک مسلمان ہو جائے تو اس پر پھر عشر ہی وصول کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف حضرت حسن اور عطاء کے مسلک کو پسند فرماتے ہیں۔ فکان قول الحسن وعطاء احسن عندی من قول ابی حنیفة حضرت امام کے استدلال گرامی کا جواب ارشاد ہوتا ہے۔

الا ترى ان المال يكون للمسلم للتجارة فيمر به على العاشر فيجعل عليه ربع العشر فاذا اشتراه ذمي فمر به العاشر لتجارة جعل عليه نصف العشر ضعف ما على المسلم فان عاد الى مسلم جعلت فيه ربع العشر فهذا مال واحد يختلف الحكم فيه على من يملكه فكذلك الارض من ارض العشر (الخراج ص۱۲۵)

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ زمین کی بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں بلکہ یہ مالک کے تابع ہے جیسے تجارت کا مال اگر مسلمان اسے چنگی سے لے کر گزرے تو اسے ربع العشر (چالیسواں حصہ) دینا ہو گا اور اگر یہی مال غیر مسلم خریدے تو اس سے نصف العشر (بیسواں حصہ) لیا جائے گا پھر اگر مسلمان خریدے تو اس سے چالیسواں حصہ وصول ہو گا۔ غرض مالک کی تبدیلی سے خراج وعشر کی نوعیت بھی بدلتی رہے گی حضرت امام اس میں مالک کو زمین کے تابع فرماتے ہیں جو درست نہیں۔ مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھ لینے کے بعد سب اصل دلیل پر بحث کی جائے اور نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے تو طعن و تشنیع کے بغیر ہی مسئلہ صاف ہو جاتا ہے

سلف کا یہی انداز تھا۔ امام ابویوسفؒ کی کتاب الخراج میں اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے علماء معمولی اختلافات پر مویساً قمطریرا بنے پھرتے ہیں اور اس کا نام تقویٰ رکھا جاتا ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

الاعتصام: ۲۶ مئی ۱۹۵۰ء

نمازِ عیدین میں احناف کی اقتداء

"الاعتصام میں مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ شائع ہوا جس میں عیدین کی نماز میں تکبیرات کی تحقیق تھی مولانا نے لکھا کہ عیدین کی نماز بارہ تکبیرات کے ساتھ مسنون ہے اور چھ تکبیرات کا صحیح ثبوت نہیں اس لیے اہلِ حدیث کے لیے عیدین میں احناف کی اقتداء درست نہیں اس پر مولانا مرحوم نے ذیل کا شذرہ رقم فرمایا۔" (مرتب)

(۱)

تکبیراتِ عید کے متعلق اہلِ علم کے دو مسلک ہیں، ایک گروہ بارہ تکبیرات قبل القراءۃ کا قائل ہے، امام مالک، امام احمد، امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی معمول ہے، اس مسلک کی تائید عمرو بن عوف حضرت عائشہ، ابنِ عمر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد موذن کی روایات سے ہوتی ہے۔ عمرو بن عوف کی روایت کو "احسن شیء یروی فی ھذا الباب" فرماتے ہیں حالانکہ اس میں کثیر بن عبداللہ راوی متہم بالکذب ہے۔ (شافعی، ابوداؤد، ابنِ حبان، میزان الاعتدال) میں حضرت عائشہ کی روایت بحوالہ ابوداؤد ہے اور اس کے راوی ابن لہیعہ ہیں ان کا ضعف مشہور ہے ابنِ عمر کی روایت دارقطنی وغیرہ میں ہے اس میں فرج بن فضالہ منکر الحدیث ہے (بخاری) سعد مؤذن کی روایت میں بقیہ ضعیف ہے اور عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت میں حسن بجلی ضعیف ہیں، عبداللہ بن عمرو کی روایت کے متعلق امام بخاری فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے عراقی اس کی سند کو صالح کہتے ہیں دراصل یہی حدیث ہے جسے احسن شیء روی فی الباب کہنا چاہیے ترمذی کی ترجیح تحسین کا مدار بھی طرق کے تعدد پر ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ ان کی مصطلح تحسین تو غرابت کے منافی ہو سکتی ہے۔ اس کا مفاد لغوی تحسین بھی نہیں ہو سکتا عبداللہ بن عمرو کا طریق وہی ہے جو وہ عن ابیہ عن جدہ سے روایت فرماتے ہیں اسی سند پر محدثین کی گفتگو مشہور ہے سند بلاشک قابلِ اعتماد ہے علی الاطلاق ضعیف نہیں لیکن صحیح کی ان اعلیٰ اقسام سے بھی نہیں جن کی مخالفت کو انشراح کے ساتھ ناجائز اور نادرست کہا جا سکے۔

دوسرے مسلک کی تائید صرف بعض آثار سے ہوتی ہے مرفوعاً صرف حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ایک

حدیث مروی ہے جس کی سند میں عبدالرحمٰن بن ثابت بن ثوبان علنسی ہیں جن میں آئمہ حدیث کو کلام ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ بھی حضرت ابن مسعود کا اثر ہے مرفوع نہیں اس لیے اس میں تو کلام نہیں کہ توازن احادیث کے لحاظ سے پہلا مسلک راجح ہے اور احناف رحمہم اللہ کا مسلک آئمہ حدیث کے نقطۂ نظر سے ضعیف ہے۔

بایں ہمہ محترم المقام مفتی صاحب کا ارشاد کہ "اہل حدیث نمازِ عید میں حنفی کی اقتدار نہ کرے" انصاف پر مبنی نہیں، میں یقین رکھتا ہوں کہ محترم مفتی صاحب اپنے اس فتویٰ پر نظرِ ثانی فرمائیں گے۔ مسلکِ اہلِ حدیث کی اساس تو صرف اس اصل پر ہے کہ اجتہادی مسائل میں فرقہ وارانہ عصبیت سے احتراز کیا جائے اور ترجیح کی بنیاد دلائل پر ہونی چاہیے مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ خود ایک فرقہ بن رہے ہیں۔ اعاذنا اللہ من الافتراق الشنیع۔

ایسے فرعی اجتہادی مسائل میں اپنے مسلک کی حمایت اور عملاً اس کی پابندی تو ازلبس ضروری ہے لیکن دوسرے کی اقتدار کے عدمِ جواز کا فتویٰ نارداجسارت ہے اور اہلِ تحقیق کے لیے قطعی نامناسب، اہلِ تحقیق کو امام بخاری اور شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ کی طرح وسیع الصدر رہنا چاہیے اور اقتدار کے معاملہ میں اہلِ بدعت کو بھی بالکل نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ملاحظہ ہو فتاویٰ ابنِ تیمیہ مطبوعہ اہل نجد جدید۔ حضرت المحترم شیخ مولانا انور شاہ صاحب اور ان کے تلامذہ کی یہ عادت تھی اور ہے کہ اگر شوافع یا موالک وغیرہ احناف کے شروط وقیود کی پابندی کریں تو اقتدار درست ہے یہ بات بھی بے معنی اور مبنی بر تعصب ہے امام اگر دیانۃً ایک مسلک کو صحیح سمجھ کر اس کا پابند ہے تو مقتدی کو اس کی تحقیق سے اتفاق ہو یا نہ ہو اقتداً میں کوئی حرج نہیں۔ تشکیک کی موجودگی میں اگر عبداللہ بن مسعود کی اقتداد درست ہے تو احناف کی تکبیراتِ ستۃ منسوخہ اس سے زیادہ کڑوی نہیں اس لیے اہلِ حدیث کے لیے احناف کی اقتدار بلانکیر درست ہے۔

والسلام۔ محمد اسماعیل گوجرانوالہ

(۲)

"حضرتِ مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی رحمہ اللہ نے اس کے بعد تکبیراتِ عیدین پر دوبارہ مفصل بحث فرمائی اور اس شذرہ پر ادر الاعتصام کی پالیسی پر تنقید فرمائی اس مضمون کو شائع کرتے ہوئے شروع میں حضرت الاستاذ مولانا محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے یہ نوٹ لکھا" (مرتب)

الاعتصام (مورخہ ۱۰ رنومبر ۱۹۵۷ء) میں محترم مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کا ایک فتویٰ تکبیراتِ عیدین کے متعلق شائع ہوا تھا مولانا کا خیال تھا کہ نمازِ عید میں احناف کی اقتدار اہلِ حدیث کے لیے درست نہیں

کیا دیہات میں نمازِ جمعہ فرض ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جمعہ گاؤں میں ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں بعض لوگ گاؤں میں بھی جائز کہتے ہیں اگر یہ غلط ہے تو کیوں؟ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق۔ جمعہ شہر اور دیہات میں جہاں ادا کرنا ممکن ہو فرض ہے قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (جمعہ)

اس آیت میں عام اہلِ ایمان کو مخاطب فرمایا گیا ہے کہ جمعہ کے دن جب اذان ہو تو کاروبار تجارت و زراعت) چھوڑ کر نماز کے لیے توجہ اور پوری کوشش سے آؤ۔

اس اذان سے وہی اذان مراد ہے جو جمعہ کے دن بوقتِ خطبہ دی جاتی ہے۔

حافظ ابن العربی فرماتے ہیں۔

قال بعض العلماء کون الصلوٰة الجمعة ههنا معلوم بالاجماع لا من نفس اللفظ و عندی انه معلوم من نفس اللفظ بنکتة وهی قوله من یوم الجمعة وذلك یفیده لان النداء الذی یختص بذلك الیوم هو نداء تلك الصلوٰة فاما غیرها فهو عام فی سائر الایام ولو لم یکن المراد به نداء الجمعة لما کان لتخصیصه بها و اضافته الیها معنی ولا فائدة اھ (احکام القرآن لابن العربی ص۲۶۷)

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں سے نمازِ جمعہ مراد لینا الفاظ کا مفاد نہیں بلکہ اجماع سے ثابت ہے۔ ابنِ عربی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک آیت کا مفاد یہی ہے کیونکہ اذان کے ساتھ یوم الجمعہ کی تخصیص کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مراد وہ اذان ہے جس کا تعلق نمازِ جمعہ سے ہے۔ باقی اذانیں سب دنوں میں عموماً ہوتی رہتی ہیں۔ اگر نمازِ جمعہ مراد نہ ہوتی تو اس تخصیص اور تعیین کا کوئی فائدہ نہیں۔

اسی طرح بیع کا تذکرہ بھی ایک ضروری اور اہم شغل کے طور پر کیا گیا۔ اگر جمعہ کی اذان کے وقت کھیتی باڑی یا کوئی دوسرا کام کر رہا ہو تو اسے بھی ترک کرنا ضروری ہے۔ یہاں ابن العربی نے بعض ائمہ سے اختلاف کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ جن کے نزدیک نکاح، ہبہ، صدقہ وغیرہ امور اذانِ جمعہ کے وقت فسخ نہیں ہونگے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

والصحیح فسخ الجمیع لان البیع انما منع للاشتغال فکل امر یشغل عن الجمعة من العقود کلها فهو حرام شرعا اھ (احکام القرآن ص۵۴۰ ج۲)

صحیح یہ ہے کہ جس قدر امور عقود وغیرہ جمعہ سے مشغول اور غافل کریں وہ شرعاً حرام ہیں۔ قال عطاء تحرم الصناعات کلها ص۱۴۵۔ صحیح بخاری مع قسطلانی ج۲ قسطلانی فرماتے ہیں۔

یحرم البیع ونحوه من العقود مما فیه تشاغل عن السعی ص۱۴۷ ج۲

غرض جہاں بھی جمعہ فرض ہوگا وہاں بیع وشرا اور عقود وزراعت وغیرہ جملہ مشاغل ممنوع ہونگے بیع سے خرید و فروخت بلحاظ شغل مقصود ہے۔ شہر یا دیہات اور قصبات میں جو مشاغل ادائے جمعہ سے مانع ہوں وہ امر فاسعوا کے منافی ہیں۔ اور وَذَرُوا الْبَيْعَ سے ان کا ترک مقصود ہے۔ مناظرات کے دور کی یہ نکتہ سنجی ہے کہ بیع سے مراد صرف خرید و فروخت ہے اور دیہات کے رہنے والوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ دیہات میں خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے متصل احادیث میں تاکید فرمائی ہے۔ اس میں شہر اور دیہات میں امتیاز نہیں فرمایا۔ عن ابی ھریرۃ وابن عمر قالا سمعنا رَسُوْلَ اللهِ صلی الله علیه وسلم عَلٰی اَعْوَادِ مِنْبَرِهٖ لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الْجُمُعَاتِ اَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ثُمَّ لَيَكُوْنُنَّ مِنَ الْغٰفِلِيْنَ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر فرمایا لوگ جمعہ کو ترک کرنا چھوڑ دیں ورنہ ان کے دلوں پر مہر کی جائے گی اور انہیں غافلوں میں شمار کیا جائے گا۔

عَنْ اَبِي الْجَعْدِ الضَّمْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمَعٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللهُ عَلٰی قَلْبِهٖ (ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجه، منتقی ص۲) جو آدمی تین جمعے سستی سے چھوڑ دے اس کے دل پر مہر کر دی جاتی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْجُمُعَةُ عَلٰی مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ (ابوداؤد) جو جمعہ کی اذان سنے اس پر جمعہ فرض ہے۔

عن طارق بن شہاب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ اِلَّا عَلٰی اَرْبَعَةٍ عَبْدٍ مَمْلُوْكٍ اَوِ امْرَاَةٍ اَوْ صَبِيٍّ اَوْ مَرِيْضٍ۔ (ابوداؤد، منتقی ص۸۱ ج۲)

جمعہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ البتہ غلام، عورت، بچے اور بیمار پر فرض نہیں۔

یہاں دیکھیے اعذار کے لحاظ سے بعض لوگوں کو آپ نے مستثنیٰ فرمایا ہے لیکن ظرف و مقام کے لحاظ

سے کوئی استثناء نہیں فرمایا۔ حالانکہ اس قسم کے استثناء کے لیے یہ مناسب موقعہ تھا۔

عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَعَلَیْہِ الْجُمُعَۃُ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ اِلَّا مَرِیْضٌ اَوْ مُسَافِرٌ اَوِ امْرَاَۃٌ اَوْ صَبِیٌّ اَوْ مَمْلُوْکٌ فَمَنِ اسْتَغْنٰی بِلَھْوٍ اَوْ تِجَارَۃٍ اِسْتَغْنَی اللّٰہُ عَنْہُ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (دارقطنی) جس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پہ ایمان ہے جمعہ کے دن اس پہ جمعہ ضروری ہے۔ بیمار، مسافر، عورت، بچے اور غلام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جو آدمی غفلت یا کاروبار کی وجہ سے استغناء کرے اللہ اس سے مستغنی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جمعہ سے جلد ہٹنے والوں کے گھروں کو جلا ڈالنے کا قصد فرمایا۔ (مسلم، منتقی ۱ ص ۲/۶)

ابن عباسؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ جو بلا عذر جمعہ ترک کرے اس کا نام منافقوں کی کتاب میں درج کر دیا جاتا ہے۔ پھر اسے مٹایا نہیں جاتا۔ (شافعی)

ایک مناظر ذہن کے لیے بحث کی گنجائش ہے کہ ان احادیث میں دیہات کا تذکرہ صراحۃً نہیں لیکن احادیث کے مقاصد پہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز اور اس میں وعظ و تذکیر کو زیادہ سے زیادہ عام فرمانا چاہتے ہیں اور اس سے اغماض کرنے والوں سے نفرت فرماتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ ھَلْ عَسٰی اَنْ یَّتَّخِذَ اَحَدُکُمُ الصُّبَّۃَ مِنَ الْغَنَمِ عَلٰی رَاْسِ مِیْلٍ اَوْ مِیْلَیْنِ فَیَتَعَذَّرُ عَلَیْہِ الْکَلَاُ فَیَرْتَفِعُ ثُمَّ تَجِیْءُ الْجُمُعَۃُ فَلَا یَشْھَدُھَا ثُمَّ تَجِیْءُ الْجُمُعَۃُ فَلَا یَشْھَدُھَا ثُمَّ تَجِیْءُ الْجُمُعَۃُ فَلَا یَشْھَدُھَا حَتّٰی یُطْبَعَ عَلٰی قَلْبِہٖ (ابن ماجہ)

تم سے کوئی میل دو میل دور اپنی بکریوں کا ریوڑ لے جائے پھر گھاس نہ ملنے کی وجہ سے وہ اوپر چلا جائے اور تین جمعے غیر حاضر رہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے آدمی کے دل پہ مہر کر دی جائے گی۔

ان احادیث میں صحیح اور ضعیف روایات موجود ہیں جو مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کی مؤید ہیں۔ اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر آدمی جس کے لیے جمعہ ادا کرنا ممکن ہو اس پہ واجب ہے کہ نمازِ جمعہ میں حاضر ہو۔ یہی ان احادیث کی روح ہے۔

دیہات اور فقہائے حنفیہ رح

مذاہب آئمہ کی تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف فقہاءِ حنفیہ رحمہم اللہ اہلِ دیہات کو جمعہ کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔

کو سختی سے روکتے ہیں۔ غلام، مریض اور مسافر کے متعلق خود فقہاء رحمہم اللہ کی تصریح موجود ہے کہ اگر یہ لوگ جمعہ میں حاضر ہو جائیں تو ظہر ان سے ساقط ہو جائے گی۔ مگر دیہات کو جمعہ سے محروم رکھنے پر معلوم نہیں کیوں اصرار ہے ۱۳۴۶ھ کی ہجرت کے بعد مولوی الیاس مرحوم کے معتقدین جہاں اقامت پذیر ہوئے ہیں ان کا وطیرہ ہے کہ وہ جمعہ کو روکنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ اگر اہل دیہات کو مسافر وغیرہ کی طرح اجازت دے دی جائے کہ وہ دیہات میں جمعہ ادا کر لیں۔ تو ان سے ظہر ساقط ہو جائے گی تو شرعی احکام سے قطع نظر اس میں تھوڑی سی معقولیت ہوتی۔ لیکن بعض دیہات میں تو ان تبلیغی حضرات نے جمعہ کے متعلق ہنگامہ برپا کر دیا۔ پارٹیاں بن گئیں۔ حالانکہ اہل دیہات پر جمعہ کی فرضیت کے متعلق قرآن اور سنت میں کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اور جمعہ سے روکنے کے لیے تو کچھ بھی نہیں۔

امام بخاریؒ صحیح میں فرماتے ہیں۔ بَابُ الْجُمُعَةِ فِی الْقُرٰی وَالْمُدُنِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ أَوَّلَ جُمُعَةٍ جُمِّعَتْ بَعْدَ جُمُعَةٍ فِی مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی مَسْجِدِ عَبْدِ الْقَیْسِ بِجُوَاثٰی مِنَ الْبَحْرَیْنِ یعنی مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ قبیلہ عبد القیس نے مقام جواثی میں پڑھا۔ جو علاقہ بحرین میں ایک گاؤں ہے۔ وکیع فرماتے ہیں۔ قریۃ من قری البحرین (صحیح بخاری مع الفتح جلد ۲ ص۲۵۹)

حافظ فرماتے ہیں — اشارۃ الی خلاف من خص الجمعۃ بالمدن دون القری و ھو مروی عن الحنفیۃ و اسندہ ابن ابی شیبۃ ..... عن حذیفۃ عن علی اھ حوالہ سابق۔

امام بخاریؒ نے ان حضرات سے اختلاف فرمایا ہے جو صرف شہروں میں جمعہ جائز سمجھتے ہیں دیہات میں درست نہیں سمجھتے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت علیؓ سے بھی یہ مسلک نقل کیا ہے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت عمرؓ کا اثر ذکر فرمایا ہے۔

أَنَّہُ کَتَبَ اِلٰی أَھْلِ الْبَحْرَیْنِ أَنْ جَمِّعُوْا حَیْثُمَا کُنْتُمْ اھ آپؓ نے بحرین والوں کو حکم دیا۔ "تم جہاں بھی ہو جمعہ ضرور پڑھو" (ابن ابی شیبہ وصححہ ابن خزیمہ)

بیہقیؒ نے لیث بن سعد سے نقل فرمایا ہے۔ کُلُّ مَدِیْنَۃٍ أَوْ قَرْیَۃٍ فِیْھَا جَمَاعَۃٌ أُمِرُوْا بِالْجُمُعَۃِ فَاِنَّ أَھْلَ مِصْرَ وَسَوَاحِلِھَا کَانُوْا یُجَمِّعُوْنَ الْجُمُعَۃَ عَلٰی عَھْدِ عُمَرَ وَعُثْمَانَ بِاَمْرِھِمَا وَفِیْھِمَا رِجَالٌ مِّنَ الصَّحَابَۃِ وَعِنْدَ عَبْدِ الرَّزَّاقِ بِاِسْنَادٍ صَحِیْحٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّہُ کَانَ یَرَی أَھْلَ الْمِیَاہِ بَیْنَ مَکَّۃَ وَالْمَدِیْنَۃِ یُجَمِّعُوْنَ فَلَا یَعِیْبُ عَلَیْھِمْ (فتح الباری ص۲۵۹ ج ۲) لیث بن سعد فرماتے

ہیں ہر بستی اور شہر میں جہاں مسلمانوں کی جماعت ہو وہاں جمعہ ادا کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اس نے یہ حدیث ذکر فرمائی ہے۔ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ الخ تم سب اپنے حلقۂ اقتدار میں حاکم ہو اور تم سے تمہاری رعیّت کے متعلق باز پرس ہو گی۔ ابن منیر فرماتے ہیں اس حدیث سے ظاہر ہے کہ جمعہ کے لیے نہ امیر شرط ہے نہ شہر۔ بلکہ دیہات میں جمعہ کی اجازت ظاہر ہوتی ہے۔

اسی طرح اسعد بن زرارہ کی روایت سے ظاہر ہے وہ نقیع الخضمات میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے یہ بستی مدینہ منورہ سے قریباً ایک میل ہے۔ ان آثار کا تذکرہ حافظ شوکانی نے نیل الاوطار میں اور حضرت مولانا شمس الحق نے عون المعبود میں بھی فرمایا ہے۔ امام بیہقیؒ نے ان تمام آثار کا تذکرہ سنن کبریٰ میں ج ۳ صفحہ ۱۷۹ - ۱۷۸ میں اپنی سند سے فرمایا ہے۔ ان آثار سے ظاہر ہوتا ہے اس وقت عام دیہات بلکہ ڈیروں میں بھی جمعہ بلا نکیر ہوتا تھا صحابہؓ میں گو حضرت علیؓ وغیرہ اس کے خلاف تھے لیکن وہ روکنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ غالباً یہ سنت حضرات دیوبند سے شروع ہوئی ہے جس کا احیاء جناب مولوی الیاس کی تبلیغی جماعت کر رہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حافظ خطابی [illegible] معالم السنن ص ۲۴۵ ج ۱ میں اسعد بن زرارہ کی حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔
وفی الحدیث من [illegible] الفقه ان الجمعة جوازها فی القریٰ کجوازها فی المدن والامصار لان حرۃ بنی بیاضة [illegible] قریة علی میل من المدینة اھ

اس حدیث [illegible] ہی نکتہ یہ ہے کہ دیہات میں جمعہ اسی طرح جائز ہے جس طرح چھوٹے اور بڑے شہروں میں [illegible] بیاضہ مدینہ سے ایک میل پر ایک گاؤں ہے۔ جہاں اسعد بن زرارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف [illegible] سے پہلے جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں اس کی صراحت فرمائی [illegible] ۱ جلد ۲۔ حرہ بنی بیاضہ کا تذکرہ شروح حدیث سبل السلام، فتح العلام، عون المعبود وغیرہ میں مرقوم [illegible] چھوٹی سی بستی ہے اور یہ خیال کہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی رہا ناممکن ہے۔ اسعد بن زرارہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے چند دن پہلے جمعہ پڑھایا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو مشکل ہے کہ اتنی جلدی کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع گرامی تک نہ پہنچا ہو۔ صحابہؓ کی عادت تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی دین کی باتیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور ذکر کرتے تھے۔ اتنا اہم واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا ہو ناممکن ہے۔

اسعد بن زرارہ کی حدیث کے متعلق ابن حزم فرماتے ہیں۔ اما الشافعی فانه احتج بخبر صحیح

رویناہ من طریق الزھری۔ اھ محلی ص۵۲ ج ۵۔

صحیح احادیث سے صراحتًا اور قرآنِ عزیز اور اقوالِ صحابہؓ سے دیہات میں جمعہ کا ثبوت جب ملتا ہے تو بعض اہلِ علم جن تک یہ اطلاع نہیں پہنچی یا وہ اسے اس طرح نہیں سمجھ سکے جس طرح اسے باقی آئمہ نے سمجھا ہے تو ان سکے مقلدین کو دیہات میں جمعہ ادا کرنے سے روکنے کا حق نہیں۔ ہاں اگر وہ خود بپابندی تقلید نہیں پڑھنا چاہتے تو وہ مختار ہیں۔

مذاہبِ آئمہ | ابنِ حزمؒ فرماتے ہیں۔

ویصلیہا المسجونون والمختفون رکعتین فی جماعۃ بخطبۃ کسائر الناس وتصلی فی کل قریۃ صغرت ام کبرت (محلی ج ۵ ص۴۹)

قیدی اور معذور لوگ دو رکعت خطبہ کے ساتھ ادا کریں۔ اور بستی چھوٹی ہو یا بڑی اس میں جمعہ درست ہے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

قال بعض الحنفیین لوکان ذلک لکان النقل بہ متصلا۔

اگر جمعہ دیہات میں جائز ہوتا تو تواتر اور تعامل سے اس کا ثبوت ملتا۔

ابنِ حزمؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

فیقال لہ نعم قد کان ذلک حتی قطعہ المقلدون بضلالھم عن الحق و قد شاھدنا جزیرۃ میورقہ یجمعون فی قراھا حتی قطع ذلک بعض المقلدین لمالک وباءبالثم النھی عن صلوۃ الجمعۃ وروینا ان ابن عمر کان یمر علی المیاہ وھم یجمعون فلا ینھاھم عن ذلک عن عمر بن عبد العزیز انہ کان یامر اھل المیاہ ان یجمعوا و یأمر اھل کل قریۃ لا ینتقلون بان یومر علیھم امیر یجمع بھم (محلی ج ۵ ص۵۲)

ان حضرات سے کہنا چاہیے کہ واقعی جمعہ تمام دیہات میں ہوتا تھا۔ اور اس کا تعامل موجود تھا۔ یہاں تک کہ بعض غلط کار مقلدین نے اسے بند کرا دیا۔ اور جمعہ سے روکنے کی معصیت اپنے ذمہ لے لی۔ ابنِ عمر پانیوں اور ڈیروں پر لوگوں کو جمعہ پڑھتے دیکھتے تھے اور منع نہیں فرماتے تھے۔ عمر بن عبد العزیز نے اہلِ میاہ کو جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا اور ہر بستی کو جس کی اقامت مستقل ہو حکم دیا کہ ان کا امیر جمعہ پڑھائے۔

پھر صفحہ ۵۴ ج ۵ میں فرماتے ہیں۔

ومن اعظم البرهان عليهم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اتى المدينة وانما هي قرى صغار مفرقة بنو مالك بن النجار في قريتهم حوالي دورهم اموالهم ونخلهم وبنو عدي بن النجار في دارهم كذلك وبنو مازن بن النجار كذلك وبنو سالم كذلك وبنو ساعدة كذلك وبنو الحارث بن الخزرج كذلك وبنو عمرو بن عوف كذلك وبنو عبد الاشهل كذلك وسائر بطون الانصار كذلك فبنى مسجدا في مالك بن النجار فجمع فيه في قرية ليست بالكبيرة ولا مصر هنالك فبطل قول من ادعى ان لاجمعة الا في مصر وهذا الامر لايجهله احد لامؤمن ولا كافر بل هو نقل الكواف من شرق الارض الى غربها وبالله التوفيق ۔اھ

(محلی ج ۵ ص۵۴)

دیہات میں جمعہ سے روکنے والوں کے خلاف بڑی عظیم الشان دلیل یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو یہ خود چھوٹی چھوٹی بستیوں کی صورت میں تھی۔ بنو مالک بن نجار کا مال اور کھجوروں کے باغ الگ تھے بنو عدی بن نجار اور بنو مازن کے اموال اور زمینوں کا بھی یہی حال تھا۔ بنو سالم، بنو ساعدہ، بنو حارث بن خزرج اور بنو عمرو بن عوف اور بنو اشہل بھی اسی طرح الگ الگ دیہاتی زندگی بسر کرتے تھے۔ انصار کے تمام قبائل اسی طرح قبائلی زندگی گزارتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی بنیاد بنو مالک بن نجار میں رکھی اور جمعہ قائم فرمایا۔ یہ چھوٹی سی آبادی تھی۔ یہاں کوئی شہر آباد نہیں تھا۔

یہ صورتِ حال ہر مسلمان اور کافر پر ظاہر ہے۔ بلکہ مشرق و مغرب کے مؤرخین نے اسے نقل کیا ہے۔

ہجرت کی طویل حدیث سے جسے ابنِ سعد، ابنِ کثیر، ابو القاسم سہیلی وغیرہ نے تفصیلاً نقل فرمایا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ جب قبیلہ کے میدان کے سامنے سے گزری تو ہر قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ہاں قیام کی دعوت دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ذَرُوْهَا فَاِنَّهَا مَاْمُوْرَةٌ (اسے چھوڑ دو یہ حسب الحکم جا رہی ہے) چنانچہ ناقہ پہلے بنو مالک کی بستی میں سہل اور سہیل دو یتیم بچوں کے مربد کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر ابو ایوب انصاریؓ کے صحن کے سامنے بیٹھ گئی۔ انہوں نے پالان اٹھا کر رکھ لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں بطورِ مہمان فروکش

ہوئے - (ابن سعد - البدایہ والنہایہ - روض الانف سہیلی - ابن ہشام)

اس سے ظاہر ہے کہ مدینہ خود مصر جامع نہیں تھا - اور حضرت علی رضؓ کے اثر کے مطابق تو پر سعوں اس پر مصر جامع کی تعریف صادق نہ آسکی - وکل مدینة جامعة فهی الفسطاط ومنه قیل المدینة مصر التی بناها عمرو بن العاص الفسطاط اھ (فرائد اللغة ص ۲۸۱)

مدینہ جامعہ مصر ایسے شہر کو کہتے ہیں جس کی بنا عمرو بن العاص رضؓ نے رکھی تھی -

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو تمام اہل توحید میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جمعہ کے اجتماعیۃ اور فی الجملہ مدنیۃ کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں۔

اقول وذلك لانه لما كان حقيقة الجمعة اشاعة الدين فی البلد وجب ان ينظر الی تمدن وجماعة والاصح عندی انه يكفی اقل ما يقال فيه قرية لما روی من طرق شتی يقوی بعضها بعضا خمسة لا جمعة عليهم وعد منهم اهل البادية قال صلی الله عليه وسلم الجمعة علی خمسين رجلا اقول الخمسون يتقری بهم قرية قال صلی الله عليه وسلم الجمعة واجبة علی كل قرية .

(حجة الله البالغة ص ۳ ج ۲)

جمعہ کا مقصد شہری آبادیوں میں دین کی اشاعت ہے - اس لیے جماعت اور مدنیۃ کا لحاظ رکھنا ضروری ہوا - میرے نزدیک کم از کم جسے قریہ کہا جائے جمعہ کے لیے کافی ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باختلاف طرق مروی ہے جو ایک دوسرے کے مؤید ہیں پانچ قسم کے لوگوں پر جمعہ نہیں - ان میں خانہ بدوشوں یا دیہ نشینوں کو شمار فرمایا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پچاس آدمیوں پر جمعہ فرض ہے - شاہ صاحب فرماتے ہیں اسی تعداد پر قریہ کا لفظ بولا جاتا ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ہر بستی پر جمعہ واجب ہے -

ایک تلخ حوالہ بھی سن لیجیے -

"ازینجا معلوم شد کہ اشتراط شئے زائد بر نماز ہائے فرض برائے ایں نماز مثل امام اعظم و مصر جامع و عدد مخصوص و نحو آں مستند صحیح ندارد و دلیلے بر استحبابش نیست چہ جائے وجوب تا بشرطیت چہ رسد - (دلیل الطالب الی ارجح المطالب ص ۲۶۲)

جمعہ کے لیے امیر، مصر جامع اور عدد معین کے لیے کوئی صحیح دلیل ثابت نہیں ہوتی وجوب یا شرط تو بڑی بات ہے ان کے استحباب کی بھی کوئی دلیل نہیں ملتی -

جمعہ سے روکنا اور اس قسم کی دھاندلی کی جرأت فرقہ وارانہ دھڑے بندیوں ہی سے ہو سکتی ہے اس لیے مناسب ہے کہ بعض دوسرے فقہاء مذاہب کی آراء پر بھی غور کر لیا جائے۔ مغنی ابن قدامہ کے شارح فرماتے ہیں۔

واهل القرية لا يخلون من حالين اما ان يكون بينهم وبين المصر اكثر من فرسخ لم يجب عليهم السعي الى الجمعة وحالهم معتبر بانفسهم فان كانوا اربعين اجتمعت فيهم الشرائط فعليهم اقامة الجمعة ولهم السعي الى مصر والافضل اقامتها في قريتهم لانه متى سعى بعضهم اختل على الباقين اقامة الجمعة واذا اقاموا حضر دها جميعا الخ (الشرح الكبير لمغنی ابن قدامه ص۱۴۱ ج۲)

اس کے قریب قریب ابن قدامہ نے مغنی میں ذکر فرمایا ہے۔ (ص۱۷۱ ج۲)

اگر بستی اور شہر میں ایک فرسنگ کا فرق ہو تو ان کے لیے شہر جانا ضروری نہیں۔ بلکہ ان کے ذاتی حالات کی بنا پر فیصلہ ہوگا۔ اگر وہ چالیس ہو تو ان میں جمعہ کی شرائط پائی جائیں گی ان پر جمعہ فرض ہوگا اگر پسند کریں تو شہر میں پڑھیں۔ افضل یہ ہے کہ وہ گاؤں میں پڑھیں کیونکہ اگر کچھ شہر چلے جائیں تو باقی لوگوں کے جمعہ میں خلل واقع ہوگا۔ اگر وہ گاؤں میں پڑھیں تو سب لوگ جمع ہو جائیں گے۔

ابن رشد مالکی شروطِ جمعہ کے ذکر میں فرماتے ہیں۔ ”طبری کا خیال ہے کہ ایک امام اور ایک مقتدی ہو تو ان پر جمعہ فرض ہے۔ بعض نے فرمایا ہے امام کے علاوہ دو آدمی ہوں تو جمعہ فرض ہوگا حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام کے علاوہ تین آدمی ہوں تو جمعہ فرض ہوگا۔ امام احمدؒ اور شافعیؒ فرماتے ہیں، چالیس ہوں تو جمعہ فرض ہوگا۔ بعض نے تیس افراد کا تعین فرمایا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ ومنهم من لم يشترط عددا ولكن رأيهم انه يجوز بما دون الاربعين ولا يجوز بالثلاثة والاربعة وهو مذهب مالك وحدهم بانهم تتقرى بهم قرية۔ (بداية المجتهد ص۱۴۴) بعض نے کوئی عدد متعین نہیں فرمایا لیکن ان کا خیال ہے کہ چالیس آدمی ضروری نہیں لیکن تین اور چار افراد سے جمعہ نہیں ہوگا۔ امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے اور یہ تحدید اس لیے ہے کہ اس مقدار سے قریہ کا مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

باجی مؤطا کی شرح میں استیطان کی تفصیل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واما موضع الاستيطان فانما يعني به المصر والقرية اھ (باجی ص۱۹۶ ج۱)

ایضاً بحوالہ مذکور۔ اما القرية فان مالكا رحمه الله جعلها في ذلك بمنزلة المصر اھ

امام مالکؒ شہر اور دیہات کو جمعہ کے معاملہ میں مساوی سمجھتے ہیں۔
امام شافعیؒ کتاب الام میں فرماتے ہیں۔

سمعت عددا من اصحابنا تجب الجمعة علی اهل دار مقام اذا کانوا اربعین رجلا وکانوا اهل قریة فقلنا به الی ان قال، وروی انه کتب الی اهل قری عرینة ان یصلوا الجمعة والعیدین الخ (کتاب الام ص۱۶۹ ج ۱) ہمارے رفقاء کا یہ خیال ہے کہ جس بستی میں چالیس آدمی اقامت پذیر ہوں اس گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہے۔ مجھے اس کے خلاف کوئی حدیث نہیں ملی اس لیے میں نے یہی قول پسند کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔ تجب الجمعة علی من اقام فی غیر بناء کالخیام و بیوت الشعر ونحوها وهو احد قولی الشافعی وحکی الازجی روایة عن احمد لیس علی اهل البادیة جمعة لانهم ینتقلون فاسقطها عنهم وعلل بانهم غیر مستوطنین قال ابو العباس فی موضع اخر یشترط مع اقامتهم فی الخیام ان یکونوا یزدعون کما یزدع اهل القریة اھ (اختیارات العلمیة ص۴۷) اہل خیام اگر خیموں وغیرہ میں اقامت اختیار کر لیں تو ان پر جمعہ واجب ہوگا۔ یہ امام شافعیؒ ہی کے قول سے ماخوذ ہے۔ ازجی نے امام احمد سے روایت فرمایا ہے۔ اہل بادیہ پر جمعہ فرض نہیں کیونکہ وہ مختلف مقامات میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ابو العباس فرماتے ہیں اگر وہ زراعت کا کام شروع کر لیں تو وہ مقیم تصور ہوں گے۔

میں نے آئمہ اجتہاد اور ان کے بعض متبعین کے اقوال دو مقاصد کے لیے نقل کیے ہیں۔ اول یہ کہ اس اختلاف میں آئمہ کا مؤقف اور ان کے دلائل معلوم ہو جائیں۔ دوم ایسے اختلاف میں جہاں ہر امام اور عالم کے پیش نظر کچھ دلائل اور نظریات ہوں وہاں ایک مقلد یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنی کم علمی کی وجہ سے اپنے مسلک کی پابندی کرے لیکن دوسرے کو روکنا یا دھاندلی کرنا نہ شرعاً درست ہے نہ عرفاً جیسے کہ دیہات میں بعض مقامات میں ہو رہا ہے۔ نیز ایک امام کے اتباع اگر جبراً اپنا مسلک منوانے کی کوشش کریں تو دوسرا بھی یہی روش اختیار کرے تو ملک کا امن تباہ ہوگا۔ باہمی آویزش بڑھے گی اور یہ ہنگامے کسی امام کے نزدیک بھی درست نہیں۔

فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک جب چار آدمی جمعہ پڑھ سکتے ہیں تو شہر پر زور دینا اور اس کے لیے ہنگامہ بپا کرنا غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ شہر کی شرط کا حاضری پر کچھ تو اثر ہونا چاہیے۔ چار آدمی تو چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی جمع ہو سکتے ہیں۔ فقہائے حنفیہؒ کے مسلک کے مطابق ان دونوں باتوں

میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔

جمعہ کب فرض ہوا عموماً فقہائے حنفیہ اور شوافع رحمہم اللہ نے فرضیتِ جمعہ پر سورۂ جمعہ کی آیت یا ایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ الخ سے استدلال فرمایا ہے۔ سورۂ جمعہ جمہور آئمہ اسلام کے نزدیک مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ جیسے زرکشی اور سیوطی اور مصنف المبانی نے مقدمہ تفسیر میں بیان فرمایا ہے۔ اس لیے بعض علماء کا خیال ہے۔ جمعہ مدینہ منورہ میں فرض ہوا۔ حرہ بنی بیاضہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل اسعد بن زرارہ نے جمعہ پڑھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن سالم کی بستی میں جمعہ پڑھایا ہے۔ بنو مالک بن نجار کے ڈیرہ پر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔ اس وقت حسب ارشاد آئمہ تاریخ و سیر مدینہ خود ایک گاؤں تھا۔ اس کے بعد جواثی میں جمعہ ہوا جو بحرین کا ایک گاؤں ہے۔ بظاہر اس وقت یہ جمعے سب دیہات ہی میں پڑھے گئے۔ ان آثار سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کی فرضیت کہیں ہو لیکن مکہ میں اس کی اقامت کا موقعہ نہ مل سکا۔ اسعد بن زرارہ نے ہجرت سے پہلے حرہ بنو بیاضہ میں نماز جمعہ ادا فرمائی اور اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ یہ مقام شہر ہے یا گاؤں۔ اسعد بن زرارہ نے کعب بن لوئی کی عادت کے مطابق پڑھا ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، بہرحال حرہ بنی بیاضہ شہر نہیں۔

قریہ — مدینہ — مصر علامہ قسطلانی ارشاد الساری میں فرماتے ہیں۔ القریۃ واحد القری کل مکان اتصلت فیہ الابنیۃ و اتخذ قرارا ویقع علی المدن وغیرھا والامصار المدن الکبار واحدھا مصر والکفور القری الخارجۃ عن المصر واحد کفر بفتح الکاف (ص۱۶۶ ج۲) قری، قریہ کی جمع ہے۔ یہ اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں مکان باہم ملے ہوئے ہوں لوگ وہاں قرار پذیر ہوں۔ کبھی قریہ کا لفظ قصبہ وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے اور مصر بڑے شہر کو کہا جاتا ہے۔ شہر سے باہر کی بستیوں کو کفر کہتے ہیں۔

فرائد اللغت میں اماکن اور ان کے امتیازات کی زیادہ وضاحت کی ہے۔

القریۃ کل مکان اتصلت فیہ الابنیۃ واتخذ قرارا ویقع ذلک علی المدن وغیرھا والامصار المدن الکبار واحدھا مصر والمدرۃ القریۃ والمدینۃ یقال فلان سید مدرۃ — والکفور القری الخارجۃ عن المصر (الی) والقصبۃ المدینۃ او معظم المدن والقریۃ والبلد کلاھما اسم لما ھو داخل الربض وکل مدینۃ جامعۃ فھو قسطاط الخ ص۲۸۱۔

ان عبارات سے ظاہر ہے کہ یہ نام الگ ہیں۔ ایسے اضافی ناموں کے لغتہ میں کوئی قطعی حد نہیں۔ اس لیے کسی وقت بعض ناموں کا استعمال دوسرے ناموں کی جگہ ہو جاتا ہے لیکن یہ اطلاق حقیقی نہیں ہوگا۔ بلکہ تسامح کے طور پر ہوگا۔ بحث کو طول دینا مطلوب ہو تو علماء کے لیے چنداں مشکل نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ قریہ کا لفظ مدینہ سے چھوٹی بستی پر بولا جاتا ہے۔ مدینہ عموماً قصبہ کے مرادف ہے خصوصاً جب قریہ کا لفظ مدینہ کے بالمقابل بولا جائے تو اس سے مراد یقیناً گاؤں ہی ہوگا۔ حضرت علی رضؓ کے اثر لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع (عبدالرزاق) کے مطابق جس سے یہ اختلاف شروع ہوا ہے جمعہ نہ دیہات میں ہو سکتا ہے نہ قصبات میں نہ چھوٹے شہروں میں۔ اس کے لیے تو مصر جامع یعنی فسطاط کے سوا کوئی چارہ معلوم نہیں ہوتا۔ احناف رحمہم اللہ نے اس میں لچک کہاں سے پیدا فرمائی۔ لغت کے لحاظ سے تو مصر جامع بغداد، لاہور، دہلی ایسے شہروں پر بولا جانا چاہیے۔ اور وہیں جمعہ ہونا چاہیے حضرت علی رضؓ کے اثر کا مفاد تو اس سے چھوٹے شہروں میں پورا نہیں ہو سکتا۔

احناف کرام کا موجودہ طرزِ عمل نہ قرآنِ عزیز کے مطابق ہے نہ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ نہ حضرت علی رضؓ کے اثر سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے۔ یہ بظاہر کچھ مصالح پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ حضراتِ علماء نے جس طرف چاہا مسئلہ کا رُخ پھیر دیا۔ اثرِ علی رضؓ صرف بحث و نظر کے لیے ہے عمل کے لیے نہیں ہے۔ یہی حال حضرات احناف کا خطبۂ جمعہ کے متعلق ہے وہ عربی کے سوا خطبہ درست نہیں سمجھتے لیکن جب وقت کی مصالح نے مجبور کیا تو دو کی بجائے تین خطبے وضع فرما لیے۔ دو عربی میں تیسرا خطبہ وقتی مصالح کی نذر کر دیا گیا۔ اس بدعت کے لیے اس طرح گنجائش ہوگی جس طرح اثر حضرت علی رضؓ میں توسیع سے پیدا کر لی گئی۔

مصر کیا ہے؟ اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصر جامع کی تعریف کیا ہے؟ فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کے ہاں اب تک اس کا مفہوم متعین نہیں ہو سکا۔ والمصر عند ابی حنیفة رحمه الله کل بلدة فیها ملك واسواق ولها رساتیق ووال لدفع الظلم وعالم یرجع الیه فی الحوادث وعند ابی یوسف کل موضع له امیر وقاض ینفذ الاحکام وهو مختار الکرخی وایضاً ان یبلغ سکانه عشرة الاف۔ اھ (ارشاد الساری ص ۱۶۷/۲)

المصر هو ما لا یسعهم اکبر مساجد اهله المکلفین بها - ایضاً وظاهر المذهب انه کل موضع له امیر وقاض یقدر علی اقامة الحدود (در مختار ص ۸۳۵ ج ۱)

شامی پہلی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں۔ هذا یصدق علی کثیر من القری ص ۸۳۵ ج ۱۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں۔

اما المصر الجامع فقد اختلفت الاقاویل فی تحدیدها ذکر الکرخی ان المصر الجامع ما اقیمت فیہ الحدود ونفذت فیہ الاحکام وعن ابی یوسف روایات ذکر فی الاملاء کل مصر فیہ منبر وقاض ینفذ الاحکام ویقیم الحدود فھو مصر جامع تجب الجمعة علی اھلہ وفی روایة قال اذا اجتمع فی قریة من لا یسعھم مسجد واحد بنی لھم الامام جامعا ونصب لھم من یصلی بھم الجمعة وفی روایة لو کان فی القریة عشرة الاف او اکثر امرتھم باقامة الجمعة فیھا وقال بعض اصحابنا المصر الجامع ما یتعیش فیہ کل محترف بحرفتہ من سنة الی سنة من غیر ان یحتاج الی الانتقال الی حرفة اخریٰ وعن ابی عبد اللہ البلخی احسن ما قیل فیہ اذا کانوا بحال لو اجتمعوا فی اکبر مساجدھم لم یسعھم ذلک حتی احتاجوا الی بناء مسجد الجمعة فھذا مصر تقام فیہ الجمعة قال سفیان الثوری المصر الجامع ما یعدہ الناس مصرا عند ذکر الامصار المطلقة قال ابو القاسم الصفار عن حد المصر الذی تجوز فیہ الجمعة فقال ان تکون لھم منعة لو جاءھم عدو قدروا علی دفعہ (الی ان قال) وروی عن ابی حنیفة انہ بلد ة کبیرة فیھا سکک واسواق ولھا رساتیق وفیھا وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمہ وعلمہ او علم غیرہ اھ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للکاسانی ص ۲۵۹ ج ۱)

مصر جامع کی تعریفیں مختلف ہیں۔ کرخی فرماتے ہیں جس میں حدیں جاری ہوں اور احکام نافذ ہوں۔ امام ابو یوسفؒ سے کئی روایات ہیں۔ جس میں منبر ہو اور قاضی ہو اور حدیں نافذ ہوں جس کی مسجد میں وہاں کے لوگ نہ سما سکیں جس کی آبادی دس ہزار کی ہو یا اس سے بھی زیادہ۔ بعض اصحاب نے فرمایا جس میں ہر صنعت کار یا کاریگر اپنی صنعت پہ پورا سال گزر اوقات کر سکے۔ جس میں وہاں کی بڑی مسجد میں وہاں کے رہنے والے نہ سما سکیں۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں جس کا ذکر مطلقاً شہروں کے تذکرہ میں آجائے۔ ابو القاسم صفار فرماتے ہیں جہاں دشمن کے دفاع کے لیے سامان موجود ہو۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں جس میں بازار کوچے اور محلے ہوں اور بادشاہ ہو جو ظالم اور مظلوم میں دادرسی کر سکے۔

اس اختلاف سے ظاہر ہے نہ شارع نے یہ شرط عائد فرمائی ہے۔ نہ مصر کی کوئی جامع تعریف فرمائی ہے نہ اس کی ضرورت تھی۔ علماء نے اپنے ماحول کے لحاظ سے یہ تعریفیں کی ہیں اس لیے یہ اختلاف اور دھاندلی بالکل قدرتی ہے اس میں اہلِ علم پہ کوئی الزام نہیں۔ خرص و تخمین کا ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے۔ پانی نکالنے والے ڈول کا بھی قریباً یہی حال ہے۔

گزارش صرف اس قدر ہے کہ جب ایک چیز کی حقیقت متعین ہی نہیں اس کے متعلق بر تشدد کیوں ہو ؟ ان تعریفات میں بعض ایسی ہیں جو آج کل بڑے بڑے شہروں پہ صادق نہیں آتیں اور بعض چھوٹے چھوٹے گاؤں پہ صادق آتی ہیں۔ رہا شہر کو گاؤں بنانا یا گاؤں کو شہر بنانا ان تعریفات کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

خطبہ کا مقصد احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ میں وعظ اور نصیحت فرماتے تھے۔ کہ جمعہ کے اجتماع سے یہ فائدہ حاصل کرنا خطبہ جمعہ کا اہم مقصد ہے۔ بعض احادیث میں آیا ہے۔ اشتد غضبہ وعلا صوتہ۔ خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز بلند ہو جاتی اور چہرہ مبارک پر ناراضگی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ گویا آپ کسی لشکر کو آنے والے خطرات سے ڈرا رہے ہیں۔ اگر یہ مقصد درست ہے تو معلوم نہیں عورتوں اور اہلِ دیہات کو اس فیضان سے محروم رکھنے کی کیوں کوشش فرمائی جاتی ہے۔ کسی زمانہ میں مسلمان بادشاہ پہ زد رہتا۔ پھر عورتوں کو روکنے پہ زد رہتا اب یہ دونوں چیزیں مدہم پڑگئی ہیں۔

حضراتِ دیوبند جو فقہ حنفی پہ عمل کے زیادہ مدعی ہیں ان کے ہاں بھی بعض جگہ جمعات میں عورتیں آنے لگی ہیں اور عام مجالس میں تو اب کوئی پابندی نہیں! تعجب ہے دیہات کی آبادی سے دونوں حضرات ناراض ہیں۔ تبلیغی مجالس میں دیہاتی شریک ہوتے ہیں لیکن جمعہ کے لیے ان پہ پابندی بدستور ہے۔

حضرت الامام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا علم و فضل، زہد و تقویٰ، دقتِ نظر، وسعتِ ادراک، اسلام اور اس کے مصالح کے متعلق ان کے گہرے احساسات تاریخ اور علم رجال کی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جمعہ کے مسئلہ دیہات پہ یہ سختی کیوں ضروری سمجھی گئی۔ دیہاتیوں کے کاروبار کا یہی تقاضا ہے کہ ان کو اگر انتظام ہو سکے تو وہاں جمعہ پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ وہ اگر شہر میں آئیں تو انہیں میلوں کا سفر طے کر کے آنا ہوگا۔ اہلِ شہر کے لیے کاروبار کے معاملہ میں یہ ترجیح سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم ہے کہ اہلِ شہر کی مالی حالت اچھی ہوتی ہے وہ اگر دن کا کچھ عبادت میں صرف کریں۔ اس کے لیے سفر کر کے دوسری جگہ چلے جائیں تو اس میں معقولیت اور سنجیدگی معلوم ہوتی ہے۔ دیہاتی بے چارے میلوں شہر کی طرف بھاگیں عقلاً اچھا معلوم نہیں ہوتا اب ان کے لیے حنفی مذہب کی رو سے دو ہی راہیں ہیں۔ یا وعظ و نصیحت سے ہمیشہ کے لیے محروم رہیں پورے ماہ میں چار دفعہ بھی کلمۂ حق نہ سن سکیں یا پھر کاروبار کا نقصان برداشت کریں اور میلوں سفر کریں جانوروں کو بھوکوں ماریں۔

معلوم ہوتا ہے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذۂ کرام نے یہ حکم بعض مصالح کی بنا پہ دیا ہوگا جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر کا آخر، دورِ فسادات اور ہنگاموں کا دور تھا ممکن ہے عراق کی

دیہاتی آبادی کے لیے یہ حکم اس لیے دیا گیا ہو کہ وہ مفسدانہ اجتماعات سے بچے رہیں۔ اموی مبلغین کی آتش بیانیاں دیہاتی ذہن کو ماؤف نہ کر سکیں۔ ان حالات میں لا جمعۃ و لا تشریق الا فی مصر جامع وقتی مصالح کے مطابق ہو سکتا ہے لیکن فقہائے کرام کا اسے دائمی اور شرعی حکم قرار دینا قطعی سمجھ میں نہیں آتا۔ عفا اللہ عنا و عنہم۔ البتہ وقتی حکم ہو تو سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت امام رحمہ اللہ کا زمانہ بھی اموی حکومت کے وداع اور عباسی حکومت کی آمد ہے۔ ایسے اوقات میں دیہاتی آبادی کے لیے مناسب ہے کہ اس میں ہنگامے نہ ہوں۔

حاصلِ کلام یہ حضرت امام علیہ الرحمۃ کے اتباع کو یہ تو حق ہے کہ وہ جمعہ نہ پڑھیں لیکن جو لوگ پڑھنا چاہیں انہیں روکنا کسی طرح مناسب نہیں خصوصاً جبکہ قرآن عزیز کی صراحت میں کوئی استثناء نہیں۔ سنتِ مرفوعہ صحیحہ میں اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔ آئمہ ثلاثہ بلکہ تمام آئمہ اہلِ دیہات ہر جمعہ فرض سمجھتے ہیں فقط فقہاء حنفیہ سے بھی عوام اور متاخرین ہی اس قسم کی بے دلیل باتوں پر زور دیتے ہیں۔ حضرت امام اور ان کے اصحاب سے بھی اس تشدد کی کوئی سند نہیں ملتی۔

شبہات مناسب ہے ان شبہات کا بھی مختصر تذکرہ آجائے جن کی بنا پر متاخرین کو اس نامناسب تشدد کی جرأت ہوئی۔ انہوں نے دیہات کے اہلِ اسلام کو قرآن اور سنت کے فیوض سے محروم رکھنے کی جرأت مندانہ کوشش کیوں کی؟

قبا میں جمعہ سیوطی فرماتے ہیں۔ ومن امثلتہ ایضاً آیۃ الجمعۃ فانہا مدنیۃ والجمعۃ فرضت بمکۃ (اتقان صـ۳۸ ج۱)

جن آیات کا حکم پہلے تھا سورۃ جمعہ کی آیت اس کے بعد نازل ہوئی۔ یہ سورۃ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ اور جمعہ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکا تھا۔ فقہاءِ حنفیہؒ کا خیال ہے کہ جمعہ جب مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکا تھا تو آپؐ نے ہجرت کے بعد قبا میں کیوں جمعہ نہ پڑھا اور اہلِ قبا کو کیوں جمعہ کا حکم نہ فرمایا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قبا گاؤں تھا وہاں جمعہ فرض نہ تھا۔

جواباً گزارش ہے کہ آپ کی ارشاد فرمودہ تعریفات کے پیشِ نظر تو اس وقت مدینہ منورہ بھی دیہات ہی تھا۔ اسے شہر کہنا مشکل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے تذکرہ میں صراحتہً آیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر کی ضرورت محسوس ہوئی اس وقت مدینہ منورہ میں ایک ہی بڑھئی تھا عمارہ بن غزیہ فرماتے ہیں۔ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْطُبُ اِلٰی خَشَبَۃٍ فَلَمَّا کَثُرَ النَّاسُ قِیْلَ لَہٗ لَوْ جَعَلْتَ مِنْبَرًا قَالَ وَکَانَ بِالْمَدِیْنَۃِ نَجَّارٌ وَاحِدٌ یُقَالُ لَہٗ مَیْمُوْنٌ (فتح الباری صـ۲ ج۲)

اِن دنوں مدینہ میں بڑھئی کا کام کرنے والا ایک ہی آدمی تھا۔ یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے اس وقت بھی گاؤں میں ایک ہی نجار رہتا۔ اس سے اندازہ فرمائیے یہ کتنا بڑا شہر ہوگا۔ اس لیے قباء اور مدینہ منورہ کے متعلق قریہ یا شہر کی بحث قباء میں جمعہ نہ پڑھنے کی علت قرد یتہ کو قرار دینا اس میں کوئی استدلالی اہمیت معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ بحث کو لمبا کیا جا سکتا ہے۔

اس سے قبل ابن حزمؒ نے وہاں کی قبائلی زندگی کا تفصیلی تجزیہ فرمایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ چند قبائلی ڈیروں کے مجموعہ کا نام تھا جو الگ الگ اپنی زمینوں پہ آباد تھے۔ یہ آبادی کا انداز پہاڑی علاقوں میں خاص دیہاتی قسم کا ہے۔ آج بھی آزاد کشمیر میں ایسے دیہات موجود ہیں جو میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور وہ حقیقتاً گاؤں ہی کہلاتے ہیں۔

قباء میں قیام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت اور قیامِ قباء کے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں بضع عشرۃ (دس سے اوپر) حضرت انسؓ کی روایت میں چودہ دن مرقوم ہے۔ کلبی اور ابنِ حبان کی روایت میں جزماً چار دن فرمایا ہے۔ بعض روایات میں تین دن بھی آیا ہے۔ بنی عمرو بن عوف کے بعض بزرگ بائیس دن قیام کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ امام زہری سے تین دن کا قیام منقول ہے۔ ابنِ اسحاق پانچ دن فرماتے ہیں۔ (فتح الباری ج ۳ صفحہ ۵۷۴ - ۵۷۶)

ابنِ قیم فرماتے ہیں۔

ثُمَّ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم الْمَدِیْنَۃَ فَاَقَامَ بِقُبَاءٍ فِیْ بَنِیْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ کَمَا قَالَہٗ ابْنُ اِسْحَاقَ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَیَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَیَوْمَ الْاَرْبِعَاءِ وَیَوْمَ الْخَمِیْسِ اَسَّسَ مَسْجِدَھُمْ ثُمَّ خَرَجَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَاَدْرَکَتْہُ الْجُمُعَۃُ فِیْ بَنِیْ سَالِمِ بْنِ عَوْفٍ فَصَلَّاھَا فِی الْمَسْجِدِ الَّذِیْ فِیْ بَطْنِ الْوَادِیْ وَکَانَتْ اَوَّلَ جُمُعَۃٍ صَلَّاھَا فِی الْمَدِیْنَۃِ وَذٰلِکَ قَبْلَ تَاْسِیْسِہٖ مَسْجِدَہٗ (زاد المعاد ا ص ۹۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں حسب روایت ابن اسحاق بنو عمرو بن عوف کی بستی میں سوموار سے خمیس تک رہے اور مسجدِ قباء کا سنگِ بنیاد رکھا۔ جمعہ کے دن وہاں سے رخصت ہوئے اور سب سے پہلا جمعہ بنو سالم بن عوف میں پڑھا یہ مسجدِ نبوی کی تعمیر سے پہلا جمعہ تھا۔

ابن سعد فرماتے ہیں۔

قَالُوْا اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو عمرو بن

بَیْنَ عَمْرِ وبْنِ عَوْفٍ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالثُّلَاثَاءِ والاربعاء و الخمیس وخرج یوم الجمعة فجمع فی بنی سالم ویقال اقام فی بنی عمرو عوف اربع عشرۃ لیلة (طبقات ابن سعد ص۲۳۶ ج۱ مطبوعہ بیروت جدید)

عوف میں سوموار سے خمیس تک رہے۔ جمعہ کے دن نکلے۔ جمعہ بنو سالم میں پڑھا۔ اور کہا گیا ہے کہ بنو عمرو بن عوف میں چودہ دن قیام فرمایا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے بھی یہ تمام روایات ذکر فرمائی ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ص۱۹۸ ج ۳ ایضاً ص۲۱۲ ج۳) ابن کثیرؒ نے جہاں آپؐ نے جمعہ ادا فرمایا تھا اس مقام کا نام وادی رانوناء لکھا ہے۔

مسعودی ۳۴۶ھ فرماتے ہیں:۔ وکان مقامه بقباء یوم الاثنین والثلاثاء والاربعاء والخمیس وسار یوم الجمعة ارتفاع النهار (الی ان قال) حتی ادرکته الصلوٰة فی بنی سالم فصلی بهم یوم الجمعة (مروج الذہب ص۲۸۶ ج۲)

مسعودی نے باقی روایات کا ذکر ہی نہیں فرمایا۔ ابو القاسم سہیلی نے بھی قریباً سابقہ روایات کا ذکر فرمایا اور خلافِ عادت ان روایات میں تطبیق کی کوشش نہیں فرمائی۔ (روض الانف ج۲ ص۱۰۰)

حافظ ابن حجرؒ نے ان تواریخ کو مرتب کرنے کی کوشش فرمائی ہے لیکن تطبیق دینے کی طرف توجہ نہیں دی۔ انہوں نے واقعات اس طرح مرتب فرمائے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے نکلنا ۲۲ صفر غارِ ثور سے نکلنا یکم ربیع الاوّل۔ قباء میں داخلہ ۸ ربیع الاوّل۔ قباء میں قیام ۱۴ دن۔ مدینہ منورہ میں داخلہ ۲۲ ربیع الاوّل۔ حسب روایات کلبی داخلہ مدینہ ۱۲ ربیع الاوّل (فتح الباری ج۳)

اخباری نکتہ نظر سے کلبی کی روایت وزنی معلوم ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن مقاصد کے لیے مکہ مکرمہ سے نکلے تھے ان کی اہمیت کے پیشِ نظر بنو عمرو بن عوف میں دو ہفتے قیام کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دو چار دن سستانے کے بعد ممکن عجلت کے ساتھ حضرت کو منزلِ مقصود پہنچ کر کام شروع کرنا چاہیے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی تبلیغی مساعی کو تیز تر کر دینا چاہیے۔ یہ مقصد ابن سعد کی روایت سے بہت حد تک مطابقت رکھتا ہے اس روایت کے مطابق کوئی جمعہ ضائع نہیں ہوتا اور پہلا جمعہ پانچویں دن بنو سالم میں آیا جو قریباً ایک سو صحابہؓ کی معیت میں ادا فرمایا گیا۔

محدثانہ نقطہ نظر سے صحیح بخاری کی روایت کو ترجیح ہونی چاہیے۔ رہا جمعہ کا سوال تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسافر تھے۔ عرب کی قبائلی آبادی، ان کی تعداد، جنگی قوت، جرأت اور حوصلہ مندی کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قبیلہ خواہش مند تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے

محلہ میں قیام فرمائیں۔ اس لیے یہ سوچنا بھی ضروری تھا کہ حضرتؐ کا قیام کہیں قبائلی رقابت کو بیدار نہ کر دے۔ یہی رقابت باہمی عداوت کی آگ کے لیے ہوا کا کام نہ دینے لگے۔ یہ سوچنا از بس ضروری تھا کہ غلط مقام، غلط رفقاء کا انتخاب ساری عمر کے لیے مصیبت نہ بن جائے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ ایام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ مسافر تذبذب میں گزارے جب اقامت ہی یقینی نہ ہو جمعہ کیسے فرض ہو اور اس کی ادائیگی کیونکر ضروری ہو۔ مشہور قول کے مطابق جمعہ مکہ میں فرض ہوا لیکن ناہموار حالات کی وجہ سے ادا کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اہلِ قباء کو ممکن ہے ابھی فرضیت کا علم ہی نہ ہو اس لیے یہ خیال کہ دیہی آبادی کی وجہ سے جمعہ نہیں پڑھا گیا بالکل بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ اسعد بن زرارہ کے جمعہ کے متعلق اہلِ علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ جمعہ فرضیت کی بناء پر نہیں پڑھا گیا بلکہ یہ کعب بن لوئی کی سنت کے طور پر تھا جو عروبہ کے نام سے ہر ہفتہ میں ایک اجتماع قرار پاتا تھا۔ اس لیے اہلِ قباء یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر نہ پڑھیں تو اس کی وجہ سفر یا لاعلمی تو ہو سکتی ہے لیکن قرویت نہیں۔ اگر جمعہ کی فرضیت مدینہ منورہ میں ہو تو مسئلہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

ان روایات میں اخباری نقطۂ نظر ہو یا محدثانہ نقطۂ نظر احناف کے مسلک کی تائید کے لیے اس میں کوئی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

یہ بالکل ایسا ہے جیسے عرفات اور منیٰ میں جمعہ نہیں پڑھا جاتا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا نہ آپؐ کے رفقاء نے۔ اس لیے کہ حاجی مسافر ہوتے ہیں ان مقامات میں سفر کے لیے جمع تقدیم کی بھی اجازت ہے اور جمع تاخیر کی بھی۔ بعض حضرات نے عرفات اور منیٰ کو دیہات سمجھ کر عموم آیت یا ایہا الذین امنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ الآیۃ کے لیے مخصص قرار دیا ہے اب تو عرفات اور منیٰ میں آبادی ہے حجۃ الوداع میں ترکِ جمعہ کی وجہ یا تو جنگل ہو گا یا سفر دیہات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

غرض یہ ہے کہ آپ بنی عمرو بن عوف کے دعوی (لم ادن قیام) کو قبول فرمائیں یا ابن سعد کی روایت کو۔ احناف کے مسلک کو اس سے کچھ فائدہ نہیں۔

علامہ سمہودی (رحمہ اللہ) نے وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جلد اوّل کے کئی اوراق میں ان اجتہادی اور محدثانہ روایات کو پھیلا دیا ہے جس سے اس مقدس سفر کے کئی گوشے جستجو کی دعوت دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دور اندیشی، معاملہ فہمی، علمِ تاویل الاحادیث میں اس کامل البشر علیہ الف تحیۃ وسلام کی مہارتِ تامہ معلوم ہوتی ہے اور علومِ نبوت کے عملی آثار و عواقب کا پتہ چلتا ہے جس طرح مکہ مکرمہ

سے ہجرت کا مرحلہ کئی سال کی سوچ و بچار کے بعد عمل میں آیا تھا۔ پوری عمر اقامت کے لیے جو مقام اختیار کیا جانے والا تھا اس کے نشیب و فراز پر غور بھی اسی طرح اور اسی قدر ضروری تھا۔ وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق کی ابدی صداقت کے لیے جس قدر قدرتی ذرائع مہیا کیے جا سکتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی نے اپنی خداداد صلاحیت کو اس کے لیے صرف فرما دیا۔ اللھم صل وسلم علیہ ما اظلت الخضراء وما اغبرت الغبراء۔ سمہودی نے زیادہ تر حافظ ابن حجر وغیرہ کا تتبع فرمایا ہے۔ کچھ نئے معلومات بھی فراہم کیے ہیں۔ ان سے ان مشکلات کا پتہ چلتا ہے کہ جن کے عبور میں اتنا وقت صرف ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔

سمہودی بحوالہ تاریخ صغیر بخاری حضرت انس رضی سے نقل فرماتے ہیں۔ حتی اقبل هو وصاحبه فكمنا فی بعض جوانب المدینة وبعثا رجلا من اهل البادیة یؤذن بهما۔ دوسری روایت میں ہے۔ فكمنا فی خرب المدینة (وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۸۲) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچ کر مدینہ کے بعض ویرانوں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور ایک بدوی کو بھیجا کہ انصار کو حضرت کے آنے کی اطلاع دے دے۔ انصار نے تمام خطرات پر بقدر ضرورت قابو پالیا تھا اس لیے قریباً پانچ سو آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لیے آگئے۔ اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی بجائے قباء میں بنو عمرو بن عوف کے پاس قیام فرمایا۔

سمہودی فرماتے ہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ ابو ایوب رضی کے مکان کے سامنے بیٹھ گئی (یہ مکان بالکل اسی جگہ کے سامنے تھا جہاں مسجد نبوی تعمیر ہوئی) تو جبار بن صخر خفیہ طور پر پاؤں سے ناقہ کو ٹھکو رہے تھے۔ جنہیں حضرت ابو ایوب رضی نے تاڑ لیا اور ترشی سے انہیں روک دیا اور فرمایا۔ یا جبار لولا الاسلام لضربتك بالسیف اگر اسلام کا احترام مانع نہ ہوتا تو میں تمہیں تلوار سے درست کر دیتا۔ تم ناقہ کو اس لیے کھجاتے ہو کہ آگے چلی جائے۔

سمہودی نے ایک اور خطرہ کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔

لما نزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بنی عمرو بن عوف وكان بین الاوس والخزرج ما كان من العداوة وكانت الخزرج تخاف ان تدخل دار الاوس وكانت الاوس تخاف ان تدخل دار الخزرج (وفاء الوفاء ص ۱۸۴ ج ۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو عمرو بن عوف کے ہاں تشریف فرما تھے اوس اور خزرج میں باہم عداوت تھی۔ خزرج کو خطرہ تھا کہیں اوس کے ہاں نہ اتر جائیں اوس ڈرتے تھے کہیں خزرج کے ہاں نزول نہ ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہات سے ان کا دھڑا بھاری ہو جائے۔

ان قبائلی رقابتوں کے ہوتے ہوئے ظاہر ہے کہ آنے والے مہمان کے لیے کس قدر دوراندیشی اور معاملہ فہمی کے علاوہ نفسیاتی رجحانات کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہے۔

اسعد بن زرارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند دن قبل مدینہ منورہ تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے بعاث کے ہنگامہ میں نتیل بن حارث کو قتل کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اسعد بن زرارہ کہاں ہے؟ خیثمہ وغیرہ نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہمارا آدمی قتل کیا تھا حسب قاعدہ وہ ہمارا مفرور ہے چنانچہ رات کے دھندلکے میں اسعد بن زرارہ تشریف لائے انہوں نے اپنا سر منہ لپیٹا ہوا تھا۔ حضرت ؐ نے فرمایا تم رات کو آئے ہو حالانکہ اپنے ہمسایہ قبیلہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کافی ناخوشگوار ہیں۔ اسعد نے فرمایا حضرت احباب کی آمد کی خبر پاکر صورت حال کچھ بھی ہو مجھے خدمت گرامی میں پہنچنا تھا۔ چنانچہ حضرت اسعد بن زرارہؓ وہیں شب باش ہوئے اور صبح واپس چلے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن خیثمہ، رفاعہ اور مبشر ابنائے منذر سے فرمایا کہ اسعد بن زرارہ کو پناہ دے دو۔ انہوں نے از راہِ کرامت فرمایا آپ ان کی پناہ کا اعلان فرمادیں ہماری طرف سے خود بخود پناہ ہو جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپ ہی لوگوں کو پناہ کا اعلان کرنا چاہیے۔ چنانچہ سعد خیثمہ نے پناہ کا اعلان کیا اور صبح اسعد بن زرارہ کے گھر چلے گئے اور ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے ظہر کے وقت بنو عمرو بن عوف میں لے آئے۔ یہ دیکھ کر قبیلہ اوس نے ایک اجتماعی اعلان کیا۔ قالوا یا رسول اللہ کلنا لہٗ جار (ہم سب نے اسعد کو پناہ دے دی۔)

اس صلح وسلام کے پیغام برنے یہ پندرہ دن آئندہ کے لیے زمین ہموار کرنے میں صرف فرمائے۔ فکان شغلہ صلی اللہ علیہ وسلم من عبادۃ فی عبادۃ اتنے مقدس اور اہم النواد کو شہر اور گاؤں کی بحث بنانا ان مقدس خدمات کو کوڑیوں کے نرخ بیچنے کے مرادف ہوگا۔

اور ابھی تک چونکہ جمعہ کی فرضیت کا اعلان بھی خاص اہمیت سے نہیں ہوا تھا اس لیے اہل قبا نے اگر جمعہ نہ پڑھا ہو تو اسے جرم کیا فروگذاشت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا گو سمہودی نے سرسری طور پر ایک روایت ذکر فرمائی ہے۔ قیل انہ کان یصلی الجمعۃ فی مسجد قبا فی اقامتہ ھنالک واللہ اعلم

صـ۳ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک قبا میں رہے۔ مسجدِ قبا ہی میں جمعہ ادا فرماتے رہے۔

بعض حضرات نے قبا میں اقامت کو دیہات میں عدمِ فرضیتِ جمعہ کے متعلق بڑی مستند دستاویز سمجھ کر ذکر فرمایا ہے اس لیے مجھے کسی قدر تفصیل سے خطرات، ان کے متعلقہ تدابیر کا ذکر کرنا پڑا ورنہ قبائلی حالات کو دیکھئے بحضرات فقہائے عراق رحمہم اللہ کا یہ استدلال چنداں پختہ معلوم نہیں ہوتا۔

حالات کی سازگاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہاں کے حالات کو ہموار فرما کر اصل منزل کی طرف کوچ فرمایا۔ اب چونکہ اقامت کا مسئلہ طے ہو چکا تھا کہ قباء کی بجائے مدینہ منورہ میں ہوگی۔ جمعہ کا وقت بنو سالم میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا توقف جمعہ ادا فرمایا کیونکہ اب یہ عظیم الشان مسافر اقامت کا فیصلہ فرما چکا تھا (اللھم صل وسلم علیہ) بنو سالم سے چلنے کے بعد ناقہ نے بنی الحبلی کا رخ کیا تو عبد اللہ بن ابی نے بڑی وقاحت سے کہا اذھب الی الذین دعوك فانزل علیھم دوفا رمت[۱۸۳] ان کے ہاں اتر و جن لوگوں نے تمہیں بلایا ہے۔ اس شریر النفس کے علاوہ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ تمام قبائل نے اقامت کے لیے پیش کش فرمائی۔ ناقہ چلتی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے دعوھا فانھا مامورۃ۔ اسے چھوڑ دو یہ حسب الحکم جا رہی ہے۔ چنانچہ موجودہ مسجد نبوی کے پاس حضرت ابوایوب انصاری رضی کے مکان کے بالمقابل ناقہ تھم گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتر گئے۔ ابوایوب رضی نے سامان اپنے مکان میں رکھ لیا۔ یہ دو منزلہ مکان بقول بعض مورخین تبع الاول نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے بنایا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الرجل مع رحلہ آدمی اپنے سامان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابوایوب کے گھر چلے گئے اور یہ فقرہ ایک ضرب المثل بن گیا۔

گزارش فقہی اختلافات رہے ہیں اور رہیں گے۔ افہام اور طبائع کے اختلاف کا یہ قدرتی نتیجہ ہے۔ ہر فریق کو حق ہے کہ اپنے مکتب فکر کے لیے حمایت حاصل کرے لیکن اس کش مکش میں نبوت اور اس کے عالی قدر مقاصد کو اپنی پستیوں کے ساتھ ملانے کی سعی مناسب نہیں۔ قباء کی اقامت، اس کی مدت، مدینہ کے ماحول اور قبائلی زندگی ایسے مسائل ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ساتھ حکمت کا پتہ دیتے ہیں جو کتاب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی گئی تھی۔ اسے فقہی موشگافیوں کی نذر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

لاجمعۃ ولا تشریق اور عدد کی تخصیص حضرت علی رضی کے اس اثر پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ احناف اور شوافع نے اس پر خوب زور آزمائیاں کی ہیں۔ احناف کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور سنت کی عام اور صریح النصوص کا فیصلہ حضرت علی رضی کے اثر کی روشنی میں کیا جائے اس لیے کبھی وہ اسے حکماً مرفوع فرماتے ہیں کبھی قرآن و سنت کو مجمل قرار دے کر اثر علی رضی کو بطور تفسیر ان پر مسلط فرمانا چاہتے ہیں۔ معلوم ہے یہ سب ہاتھ کی صفائی ہے یا زبان کی ساحری اور اصطلاحات کی ہیرا پھیری۔ شوافع کا اعتراض واقعی وزنی تھا کہ آپ حضرات قرآن کی تخصیص کے لیے خبر واحد صحیح کو کبھی پسند نہیں فرماتے۔ ادھر اپنا مطلب آیا تو سارا کام حضرت علی رضی کے اثر سے لے لیا۔ اس الزام سے بچنے

کے لیے یہ تمام حیلے تراشے گئے۔ والحقیقة وراء ذلك كما هي تنتظر نادمة خزيانة۔

ادھر شوافع اسی اثر کو خارج البلد کرنا چاہتے ہیں اور اسی معاملہ میں آئمہ حدیث سے بھی انہیں خاصی مدد ملی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ آثار سے تائید تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن مسائل کا ثبوت تو بہرکیف کتاب وسنت ہی کا مرہون منت ہونا چاہیے۔ اثر علی رضؓ بصورت ثبوت بھی اس کی حیثیت صحابہؓ کے بعض تفردات کی ہوگی۔ جیسے عبداللہ بن مسعود کی تشبیک یا فاتحہ اور معوذتین کے متعلق قرآن سے علیحدگی کا خیال، ابن عباس کے نزدیک متعة النكاح کا جواز، حضرت عمرؓ کی متعة الحج سے رکاوٹ، حضرت عثمانؓ کا اتمام صلوٰة فی السفر، حضرت علیؓ کا مبتدعین کو جلانا، ابوذرؓ کا اکتناز کے متعلق تشدد۔ ایسے تفردات کو اساس قرار دے کر ظواہر کتاب وسنت کی تاویل تحقیقی مشغلہ نہیں ہے۔ اس لیے حضرات شوافع یہاں تک تو حق بجانب معلوم ہوتے ہیں لیکن بعینہٖ اسی قسم کی جمعہ کے متعلق چالیس کے عدد کی پابندی خود حضرات شوافع کے ہاں موجود ہے جس کے متعلق وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ دونوں طرف بزرگ ہیں، اہل علم ہیں، ہم کیا عرض کرسکتے ہیں۔ اثر کی حقیقت صرف اس قدر ہے۔ الحديث الاول عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لاجمعة ولا تشريق ولا فطر ولا اضحى الا فى مصر جامع قلت غريب مرفوعا۔ اس کے بعد اثر کی مختلف اسانید کا ذکر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں وهذا انما يروى عن على موقوفا فاما النبي صلى الله عليه وسلم فانه لا يروى عنه فى ذلك شئ (زیلعی ص۱۹۵)، حدیث لاجمعة ولا تشريق اثر علی مرفوعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مفہوم کی کوئی روایت ثابت نہیں۔ حضرت علیؓ سے موقوفاً یہ اثر ثابت ہے۔ حافظ عینی اور امام بیہقی اپنے اپنے مکاتب فکر کی تائید وحمایت میں جس قدر سرگرم ہیں وہ معلوم ہے لیکن اس مسئلہ میں امام بیہقی نے حضرت علیؓ کے اثر کی جو توجیہ فرمائی ہے اس سے ان کی محدثانہ روش کا پتہ چلتا ہے وہ حضرت علیؓ کے اثر کو باقی آثار کے ساتھ تطبیق دیتے وقت مصر جامع اور قریہ کے معنی میں توازن فرمانا چاہتے ہیں۔ قال الشيخ والاشبه باقاويل السلف وافعالهم فى اقامة الجمعة فى

القرى اهلها اهل قرار ليسوا باهل عمود ينتقلون ان ذلك مراد على بن ابى طالب۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کا اثر مع سند نقل فرمایا ہے۔ لا جمعة ولا تشريق الا فى مصر جامع۔ (سنن بیہقی ص۱۷۹ ج۳) امام بیہقی فرماتے ہیں کہ جمعہ کے متعلق آئمہ اسلام کے قول وفعل سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ اس قریہ میں قائم ہونا چاہیے۔ جہاں لوگ اقامت پذیر ہوں خیموں کی طنابیں اکھیڑ کر جابجا منتقل ہونے کے عادی نہ ہوں۔ حضرت علیؓ کے اثر لاجمعة ولا تشريق الا فى مصر جامع میں مصر جامع

سے اس نوعیت کے قری حضرت علی کا مقصد معلوم ہوتے ہیں۔ احناف رحمہم اللہ کے ملفوظات میں بھی تاحال نہ قریہ کی تعریف طے ہو سکی ہے نہ مصر جامع کی۔ اگر امام بیہقی کی تفسیر قبول کر لی جائے تو ممکن ہے معاملہ ختم ہو جائے۔ میری ناقص رائے میں ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اصل مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ میں اجتماعیت قائم رہے اس لیے بعض نے مصرِ جامع کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض نے چالیس کے عدد پر زور دیا۔ بعض نے ضروری سمجھا کہ مکانات کی دیواریں باہم ملی جلی ہوں۔ نقطۂ نظر یہ ہے کہ اجتماع ہو سکے۔ اگر شرائط کا زور خطیب کی اہلیت اور طریقِ خطابت پر ہوتا تو یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا۔ اچھا خطیب چھوٹی بستی میں اپنی جاذبیت سے اجتماع کی صورت بنا لیتا ہے۔ کم فہم خطیب مصرِ جامع میں بھی انتشار پیدا کر سکتا ہے۔ شرائطِ جمعہ میں خطیب کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے۔ حالانکہ اچھا خطیب اجتماعیت کی رُوح ہوتا ہے۔

میں نے اثر علی رضؓ کے متعلق گزارشات کو طول نہیں دیا۔ امام احمد اسے ضعیف فرمائیں۔ اور ابنِ حزم اسے صحیح فرمائیں۔ بہرحال وہ ایک صحابی کا فتویٰ ہے۔ اس سے ہوگا کیا؟ خود احناف کے نزدیک بھی ایسے آثار مذہب کی بنیاد نہیں بن سکتے خصوصاً جب باقی صحابہؓ سے اس کا اختلاف بھی ثابت ہو۔ عمومِ قرآن اور سنتِ صحیحہ مرفوعہ سے بھی اس کی تائید نہ ہوتی ہو ایسے اثر کے متعلق طویل بحث سے کیا فائدہ؟

جمعہ کے دِن عوالی سے آنا

عن عائشۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان الناس ینتابون الجمعۃ من منازلھم والعوالی فیاتون فی الغبار الخ صحیح البخاری مطبوعہ ہند ا ص ۸۹ ابوداؤد مع عون ص ؟ ۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں۔ لوگ جمعہ کے دن اپنے گھروں اور قریبی گاؤں سے پے بہ پے آتے ان کے پاؤں پر غبار جم جاتا۔ الخ بعض حضرات کو شبہ ہوا کہ ینتابون کا لفظ بھی آیا ہے۔ نوبت بنوبت آنے کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ ان پر فرض نہیں۔ کوئی آیا کوئی نہ آیا۔ مسئلہ کو ایک طالب علم کی طرح سوچا جائے تو زیادہ مشکل نہیں۔ حدیث میں منازل اور عوالی بواسطہ عطف ینتابون کا ظرف ہیں۔ عوالی وہ بستیاں ہیں جو تین سے آٹھ میل تک مدینہ منورہ کے قرب وجوار میں تھیں۔ منازل سے مراد وہ مکان ہیں جو اہلِ مدینہ کے مہاجر اور انصار بطورِ مسکن استعمال فرماتے تھے۔ اگر تناوب کا مفہوم وہی لیا جائے جو علمائے احناف مراد لیتے ہیں تو جمعہ مدینہ میں بھی فرض نہیں ہوگا۔ کیونکہ اپنے گھروں سے بھی لوگ باری باری آتے ہوں گے اور یہ فرضیت کے منافی ہے۔

لغت کی رو سے انتیاب کا معنیٰ ہے پے بہ پے آنا یعنی عجلت کے ساتھ ہر آدمی ایک دوسرے کے پیچھے علی التوالی چلا جائے۔ انتابت السباع المنھل رجعت الیہ مرۃ بعد اخری (مصباح المنیر) درندے گھاٹ پر یکے بعد دیگرے آتے جاتے رہے۔ انتابھم انتیابا اتاھم مرۃ بعد اخری

(اقرب الموارد ج ۲) وہ ان کے پاس بار بار آیا۔

و انتابهم انبیایا اتاهم مرة بعد اخری (قاموس المحیط ج ۱) تناوب میں تقسیم اور نوبت کا مفہوم غالب ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے وحدتِ ماخذ کی وجہ سے دونوں لفظ ایک دوسرے کے مفہوم میں مستعمل ہوں لیکن اس حدیث میں دونوں کا معنیٰ مرۃ بعد اخریٰ ہوگا کیونکہ منازل سے آنے میں کسی کا نہ آنا سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اس مفہوم کے مطابق یہ حدیث فرضیتِ جمعہ کی دلیل ہوگی۔ فرق محل کا ہوگا۔ عوالی اور قریٰ پر جمعہ فرض ہوگا۔ جو لوگ مدینہ منورہ پہنچیں، جو ایسا نہ کر سکیں انہیں لانہ" ما اپنی جگہ پر فرض کو ادا کرنا ہوگا۔ یہ بحث کہ عوالی میں غیر مستطیع حضرات نے جمعہ ادا فرمایا یا نہیں۔ اس پر برائے بحث کو جھگڑا کیا جا سکتا ہے لیکن معقولیت کا تقاضا نہیں۔ بعض آئمہ نے قریب اور بعید عوالی میں بھی فرق فرمایا ہے۔ یعنی قریب کے لوگ شہر پہنچنے کی کوشش کریں، دور کے لوگ اپنی اپنی جگہ جمعہ ادا فرمائیں۔ اس میں بھی معقولیت معلوم ہوتی ہے لیکن اہلِ قریٰ کو صرف قرویت کی وجہ سے محروم رکھنا اور فریضۂ جمعہ میں انہیں نظر انداز کرنا کسی طرح بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یقیناً جو لوگ مدینہ منورہ میں نہیں آسکے وہ گاؤں میں فرض ادا کریں گے۔

مسئلہ جمعہ میں مد و جزر ہمارے ملک میں ابتدا میں جمعہ سے اس لیے انکار کیا گیا کہ اسکا حاکم مسلمان نہیں، جب ملک میں جمعہ شروع ہو گیا تو یہ شرط بھی ڈھیلی کر دی گئی۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ آزاد علاقہ میں چونکہ کوئی مستند حکومت نہ تھی مرحوم ملا مغیدی صاحب کو اس لیے والی فرمایا گیا کہ وہ جمعہ پڑھتے تھے اور تشہد میں رفعِ سبابہ فرماتے تھے۔

پھر زور دیا گیا کہ خطبہ عربی میں ہونا چاہیے ترجمہ کرنا درست نہیں مگر کچھ لوگ خطبہ عربی زبان میں دیتے رہے اس لیے ایک نئی بدعت ایجاد فرمائی گئی۔ یعنی تین خطبے دیئے جانے لگے۔ ایک اردو میں دو عربی میں، لیکن اس مد و جزر میں عورتوں کے لیے جمعہ اور عید کی حاضری بدستور شجرِ ممنوعہ رہی لیکن بعض لوگوں نے حسبِ ارشادِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو اجازت دی۔ اب مجبوراً یہ شرط بھی استرخاء کی نذر ہو رہی ہے۔ بعض مساجد میں عورتیں آتی ہیں۔ بریلوی مساجد میں چونکہ وعظ میں موسیقی کی سی حالت پائی جاتی ہے اس لیے وہاں کثرت سے عورتیں شریک ہوتی ہیں۔

اب بحمد اللہ دیہات میں اکثر جمعہ ہو رہا ہے لیکن بحث کے لیے اب بھی یہ موضوع شاید کچھ کار آمد ہو اس لیے بہر حال دیوبندی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہے۔ ہندوستان میں سب سے قبل حضرت شیخ الکل امام المحدثین حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب نے فتویٰ دیا کہ دیہات میں جمعہ درست ہے۔

اس کے جواب میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اوثق العریٰ لکھی۔ اور حضرات ائمہ احناف کے متعارف مسلک کی تائید فرمائی۔ اس کے جواب میں کسر العریٰ مولانا محمد سعید صاحب بنارسی نے لکھی اور مولانا ابوالمکارم مئوی نے ہدایت الوریٰ ارقام فرمائی۔ ان دونوں کے جواب میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ نے احسن القریٰ کافی گرم کتاب لکھی۔ اور سے زیادہ طعن و تشنیع پر زور دیا گیا۔ یہ مولانا کی جوانی کا شاہکار ہے مالٹا سے واپسی کے بعد مولانا نے یہ مباحث بالکل ترک فرما دیئے تھے۔ بلکہ حسب روایت مولانا عبدالقادر قصوریؒ ان مساعی پر تأسف فرماتے تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

احسن القریٰ کا جواب مولانا عبدالرحمٰن صاحب بقا غازی پوری نے لکھا۔ اس کتاب کا نام ہے مشرومن دائی فی بحث الجمعۃ فی القریٰ۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ عموماً کتاب کے انداز تحریر میں متانت ہے کہیں معمولی تیزی آگئی ہے ورنہ خوب کتاب ہے۔ اس کے بعد خاموشی ہوگئی کوئی قابل اعتناء اور علمی کتاب نہیں لکھی گئی جس سے علمی حلقوں میں کچھ ہلچل پیدا ہو۔ اب ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے بعد گوڑگاواں اور علاقہ میوات کی تبلیغی مجالس والے حضرات کہیں کہیں تھوڑی بہت حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ ورنہ جمعہ بتدریج دیہات میں پڑھا جا رہا ہے لوگ اپنے حلقوں میں تبلیغ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ واللہ یہدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

الاعتصام: ۱۹ فروری ۱۹۶۰ء

۲۶ " "

۴ مارچ "

۱۱ " "

داڑھی کتنی بڑی ہو؟

داڑھی کے خلاف آج کل ایک عالمگیر نفرت ہے۔ مشرکین فرنگ، مشرکین مجوس و ہنود اور مشرکین یہود مشرکین اسلام کے ساتھ اس نفرت میں پوری طرح متفق ہیں والمتنفرجون لہم بعد ذلک ظہید۔ اور اہل علم اس میں متساہل اور خاموش، روشن خیالی کی آرزو میں روشن ضمیری سے دستکش ہونے کے لیے عملاً تیار۔ مسلک کے اہم مسائل کی آڑ میں تعلیم یافتہ طبقہ مصر ہے کہ سنت نبوی کی جگہ انہیں سنت یورپ پر عمل کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وقت کے اہم مسائل کو حل کرنے کا یہ عجیب حیلہ ہے اور ایک حیرت انگیز انکشاف، گویا وقت کے اہم اور موسم کے مشکل مسائل کا حل صرف چہرے کے چند بالوں کے اڑا دینے پر

موقوف ہے۔ ہم ایسے قدامت پسندوں کے لیے اس منطقی ربط کا سمجھنا قطعی ناممکن ہے جو ان مسائل اور بالوں میں پایا جاتا ہے اس لیے ترقی پسند حضرات کی ہر سرزنش بجا اور برمحل۔

اصلاح اور اثر اسلام نے ایک جامع دعوت دنیا کے سامنے پیش فرمائی ہے جس میں اعتقاد عمل اور جو آثار ان پر مترتب ہوتے ہیں سب کو یکساں ملحوظ رکھا ہے اور ہر ایک کو دعوت میں مناسب جگہ دی ہے اسلام کی نظر میں وضع کی درستگی اصلاح قلب کا لازمی سا اثر ہے۔ ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ وضع درست ہو اور دل درست نہ ہو لیکن یہ مشکل ہے کہ دل درست ہو اور وضع پر اس کا کچھ اثر نہ پڑے۔ اسی لیے ان آثار کی تبدیلی پر کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اعتقاد و عمل کے بعد کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ اس کا اثر خود بخود ظاہر ہو۔

اصلاح وضع میں داڑھی کے بالوں کو شرعاً خاص اہمیت حاصل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فطری عادت قرار دیا ہے۔ بعض احادیث میں خصائل فطرت پانچ آئی ہیں (بخاری) بعض میں ان کی کل تعداد دس بتائی گئی ہے (مسلم ابوداؤد) صحیح یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ دائیں اور بائیں ہاتھ کے کاموں کا امتیاز اسی قسم کا تہذیبی مسئلہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور تک انبیاء اور صلحاء ان عادات کے پابند رہے اور ان عادات کی پابندی کو امت اسلامیہ کا شعار قرار دیا گیا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

(اقول) ھذہ الطہارات منقولا عن ابراھیم علیہ السلام متداولة فی طوائف الامم الحنیفة اللہ بث فی قلوبھم ودخلت فی صمیم اعتقادھم علیہا محیاھم وعلیہا مماتھم عصرا بعد عصر ولذلک سمیت بالفطرة وھذہ شعائر الملة الحنیفیة ولا بد لکل ملة من شعائر یعرفھم بھا الخ (حجة اللہ البالغہ مصری ص ۱۸۲/۱۷ ص ۱۹۱/۲۲)

یہ پاکیزہ عادتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں۔ تمام موحد قومیں ان کی پابند ہیں۔ ان لوگوں نے دل سے اسے پسند کیا اور ان کے معتقدات کی یہ عادتیں جزو بن گئیں۔ ہر ملت کے لیے ایسے نشانات کی ضرورت ہے جن سے وہ پہچانے جائیں اور ضروری ہے ان کی وضع اس کی نظیر ہے۔

غرض اگر ملت کا دینی مزاج درست ہوگا تو یہ نشانات یقیناً اسے پسند ہوں گے۔ اگر دینی مزاج بگڑ جائے تو ان مقدس عادتوں سے خود بخود انحراف شروع ہو جاتا ہے۔ مزاج ملت کے لیے ایسے شعائر نبض کا حکم رکھتے ہیں۔ اللھم وفقنا لما تحب و ترضیٰ۔

مسئلہ کی اہمیت ان شعائر کے ترک سے خروج عن الملۃ یا ارتداد تو لازم نہیں آتا لیکن انبیاء اور دانش وران فطرت کی راہ سے انحراف ضرور ہو جاتا ہے۔ ان دس خصلتوں میں تجمل اور نظافت کا بہت حد تک خیال رکھا گیا ہے۔ اسی سے نظافت پسند غیر مسلموں نے بھی نظافت کے نقطۂ نگاہ سے ان عادات کی پابندی کی۔ کلمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم۔

مشرکین ہنود اور فرنگی تہذیب کی آمیزش نے عوام میں ڈاڑھی بڑھانے کے متعلق عجیب قسم کے خیالات پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک مختصر سی جماعت کے سوا جو اس کو دینی شعار سمجھتی ہے عوام کی غلط روی اس معاملہ میں واضح ہے۔ کسی نائی کی دکان پر چند منٹ ٹھہر کر دیکھیے کہ وہاں کاٹ چھانٹ کے کتنے نمونے بنتے ہیں اور کتنے خوش منظر چہرے حجام کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں اور چھل چھلا کر فرسودگی سے واپس ہوتے ہیں۔ ان فی ذلک لعبرۃ۔

گناہ کے عموم سے بے حسی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ عوام تو خیر عوام ہیں علماء بھی ان مسائل پر گفتگو کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ احادیثِ اعفاء کی تاویل اس طرح کی جاتی ہے کہ مداہنت کا واہمہ بھی نہ ہو۔ روشن خیالی بھی قائم رہے اور موجودہ فیشن پرستی کے لیے سندِ جواز بھی حاصل ہو جائے۔

اصحاب عزیمہ ایسے حالات میں اصحابِ عزیمت کی رفتار تیز ہو جانی چاہیے۔ سننِ نبویہ پر بوقت فساد عمل کرنے سے سو شہید کا ثواب فرمایا ہے۔ سنت کی ترویج اور اس اجرِ عظیم کے لیے اس سے بہتر وقت کونسا ہوگا۔ روشن خیالی وہی درست ہوگی جس کے ساتھ روشن ضمیری ہاتھ سے نہ جائے۔ ضرورت ہے امر بالمعروف کے تمام ذرائع اس وقت جمع کر دیے جائیں تاکہ عوام کم از کم اتنا تو محسوس کریں کہ وہ غلطی کر رہے ہیں اور ان کے دلوں میں اعمالِ صالحہ اور سننِ صحیحہ کے لیے جستجو اور خلش باقی رہے وہ گناہ کو گناہ سمجھ کر کریں اور غلطی کو غلطی سمجھیں۔ اس مسئلہ پر لکھتے وقت میں خود بھی سوچتا ہوں کہ اسے پڑھ کر عوام کے تأثرات کیا ہوں گے۔ جبکہ علماء کا شیوہ بھی تساہل کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ یورپ زدہ ذہن تو شاید یہ سننا بھی گوارہ نہ کریں کہ داڑھی شعائرِ اسلام سے ہے تاہم میں بے امید نہیں۔ چند آدمی بھی اس جمودِ عام میں اس سنت کے صحیح مقام کو سمجھ جائیں تو اس ظلمستان میں غنیمت ہوگا۔

اس معاملہ میں احادیثِ صحیحہ کا منشاء ۱۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوا اللِّحَى وَ احْفُوا الشَّوَارِبَ۔ (صحیح بخاری مع الفتح ص۲۷۳ ج۱)

۲۔ ایضاً عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَنْهِكُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللِّحَى (حوالہ مذکور)

۳۔ عنہ ایضاً اَنَّهٗ اَمَرَ بِاَحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَاِعْفَاءِ اللِّحْيَةِ (صحیح مسلم ابوداؤد ص۱۲۹ ج۱)

۴۔ عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَۃِ قَصُّ الشَّوَارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ الخ

۵۔ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَارْجُوا اللِّحٰی وَخَالِفُوا الْمَجُوْسَ (ابوداؤد۔ مسلم ص۱۲۹ ج۱)

۶۔ وفی حدیث اَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَاَرْجُوا اللِّحٰی (مسلم ص۱۲۹ ج۱)

۷۔ وفی شمائلہ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّہٗ کَانَ کَثَّ اللِّحْیَۃِ (شمائل ترمذی)

ان احادیث کا مفاد یہ ہے کہ لبوں کے بال منڈا دیئے جائیں یا جڑ سے کٹوا دیئے جائیں اور داڑھی پوری طرح بڑھائی جائے۔ احادیثِ زیرِ قلم سے داڑھی بڑھانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں یہ ذکر بصیغۂ امر آیا ہے اور بعض میں بلفظِ امر اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک بہت بھاری تھی۔ وجوب و اباحت کی اصطلاحی مباحث کو نظر انداز کر کے بھی کسی حکم کا جو مفاد ہو سکتا ہے اور امر ان الفاظ سے جن نتائج کا خواہش مند ہو سکتا ہے ان سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ جب یہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت امت پر فرض ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کی اطاعت پر امت مجبور نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح صریح احادیث کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کے عمل کو اہمیت نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی تعارض یا ترجیح کسی دوسرے کا حق ہے۔ اگر تاویل کی ضرورت ہو تو امت کے اقوال و اعمال میں ہونی چاہیئے۔ پیغمبر کو امت کے تابع نہیں کرنا چاہیے۔ صحابہؓ ہوں یا عام افرادِ امت مقامِ نبوت کی تقدیس کو نہیں پہنچ سکتے۔ اطاعت کا عہد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا ہے۔ افرادِ امت سے نہیں۔

نصِ حدیث حدیث میں اس مفہوم کو پانچ الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اَوْفُوْا ۔ اَعْفُوْا ۔ اَرْخُوْا ۔ اَرْجُوْا ، وَفِّرُوْا ۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

معنی کلھا ترکھا علی حالھا ھذا ھو الظاھر من الحدیث الذی یقتضیہ الالفاظ وھو الذی قالہ جماعۃ من اصحابنا وغیرھم من العلماء (نووی ص۱۲۹ ج۱)

ان تمام الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ داڑھی اپنی حالت پر چھوڑ دی جائے اور حدیث کا بظاہر یہی مطلب ہے اور علماء کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔

قال فی مجمع البحار ص۳۰۱ ج۲ فیہ امر باعفاء اللحی وھو ان یوفر شعرھا ولا یقص کالشوارب الخ اس میں داڑھی بڑھانے کا حکم ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔ ومعنی الکل ترکھا علی حالھا ویکرہ حلقھا وقصھا الخ ان تمام الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے نہ

کترایا جائے نہ منڈایا جائے۔ قال النووی اترکوھا ولا تتعرضوا لها بتغییر (ص ۱۲۹ ج ۱ نووی) داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کرو۔ قال الطبری ذھب قوم الی ظاھر الحدیث فکرھوا تناول کل شیء من اللحیۃ من طولها وعرضها (فتح ص ۲۷۲ ج ۱۰) ایک جماعت نے حدیث کے صریح مفہوم کو پسند فرمایا اور طول وعرض سے کٹانا ناپسند کیا ہے۔

قال عیاض یکرہ حلق اللحیۃ وقصھا وتحذیفھا الخ۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں۔ داڑھی منڈانا کترانا اس میں کمی کرنا ناجائز ہے لیکن طولِ فاحش میں کمی درست ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر حدیث کے خلاف ہے۔

مفہوم لغوی اب اعفاء، ارخاء، ایفاء، ارجاء، توفیر کے لغوی معنی پر غور فرمائیے۔ ان الفاظ میں تکثیر وتکمیل کے معنی کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مفہوم کمی اور نقص کے منافی ہے جو حلق اور تقصیر کا لازمی مفاد ہے۔ صاحب جامع الصحیح رحمہ اللہ نے لغوی شہادت کے طور پر آیۃ سورۃ اعراف کا ذکر فرمایا ہے۔ حتی اذا عفوا کثروا وکثرت اموالھم۔ یعنی ان کے مال اولاد میں بڑی کثرت ہوئی۔

قال ابن قتیبۃ حتی عفوا ای کثروا ومنہ الحدیث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر ان تحفی الشوارب وتعفی اللحی ای توفر (قرطبی ص ۱۷۹)

عفو کے معنی کثرت کے ہیں۔ اور حدیث اعفوا اللحی کا بھی یہی مطلب ہے۔

ابن دقیق العید فرماتے ہیں۔ حقیقۃ الاعفاء الترک وترک التعرض للحیۃ یستلزم تکثیرھا۔ (فتح الباری ص ۱۷۳، جلد ۱)

عفا الشیء کثر وفی التنزیل حتی عفوا ای کثروا ویقال عفوت الشعر عفوا وعفیتہ واعفیتہ عفیا ترکتہ حتی یکثر ویطول ومنہ احفوا الشوارب واعفوا اللحی (مصباح المنیر مختصراً)

قال الراغب اعفیت کذا ای ترکتہ یعفو ویکثر ومنہ قیل اعفوا اللحی والعفاء ما کثر من الوبر والریش الخ (مفردات القرآن)

نواب صدیق حسن خاںؒ فرماتے ہیں "مراد باعفا گذاشتن ریش بحال او ست بدون حلق و تکثیر وانبوہ کردن او" (ہدایۃ السائل ص ۱۲)

پھر فرماتے ہیں "ابو حنیفہؒ گفتہ اعفاء لحیہ ترک اوست تا آنکہ انبوہ وبسیار شود (ص ۱۲)

قال عیاض قوله امر باعفاء اللحی ای بتوفیرھا یقال عفا الشئ اذا اکثر و یقال فیہ اعفیت الشئ و عفیتہ اذا اکثرتہ و تفسیرہ فی الحدیث الآخر فیرد اللحی ومنہ فی الحدیث الآخر اذا دخل صفر وعفا الوبر الخ (مشارق الانوار ص ۹۸ ج ۲) کذا فی القاموس والمنجد والنہایۃ و اقرب الموارد وغیر ذلک من کتب اللغۃ وشروح الحدیث۔

ان تمام حوالوں کا منشاء یہ ہے کہ عفو کے معنی لغۃ میں تکثیر اور انبوہ کے ہیں اور داڑھی کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی مقصود ہے۔ کیونکہ اسلامی وضع میں یہ ایک اہم اسلامی شعار ہے۔ داڑھی بڑھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ اس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ یہ تو فطرت کا طبعی فعل ہے اس کے لیے قانونی حد نہیں مقرر کی جا سکتی۔ کہیں چند بالوں تک یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے اور کہیں پوری چھاتی اس کی لپیٹ میں آ جاتی ہے البتہ کترانا چونکہ انسانی فعل ہے اس کی تحدید ضروری ہے اور دلیل بذمہ مدعی۔ ارخاء، رخاء استرخاء، رخو یہ قریب المعنیٰ الفاظ ہیں جن میں نرمی اور وسعت ملحوظ ہے۔ فرس رخاء ای وسیع الجری۔ ارخوا اللحیۃ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اسے اپنی طبعی رفتار سے لٹکنے اور بڑھنے کا موقع دیا جائے۔

وفاء، ایفاء، توفی یہ الفاظ تکمیل و اتمام کی تعبیر کے لیے مستعمل ہوئے ہیں۔ قال الراغب الوافی الذی بلغ التمام یقال درھم واف وکیل واف واوفیت الکیل والوزن الموفون بعھدھم وغیرہ امثلہ میں اتمام و تکمیل کا مفہوم ظاہر ہے گویا ریش کا شرعًا کامل رکھنا ضروری ہے۔ کذا فی دواوین اللغۃ۔

ارجاء۔ اس کے معنی تاخیر اور مہلت کے ہیں و آخرون مرجون لامر اللہ۔ ارجوا اللحی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی بالوں کو چھوڑ دو۔ اس تاخیر کے لیے بڑھنا ضروری ہے اور یہی شارع علیہ السلام کا مقصود ہے۔

وفر، وفور، توفیر۔ الوفر المال التام یقال وفرت کذا تممتہ وکملتہ ویقال ان جھنم جزاءکم جزاء موفورا و وفرت عرضہ اذا لم تنقصہ (مفردات القرآن) وفروا اللحی صحیح بخاری کے الفاظ ہیں جس کا مطلب ہو گا کہ داڑھی کو مکمل کرو۔ اتمام و تکثیر اس کے معنی میں ضروری ہیں۔ مصباح، مختار الصحاح و دیگر کتب لغت ان معانی پر متفق ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زبان جانتے تھے تو پھر ان الفاظ میں تاویل کی گنجائش نہیں۔ ان مرفوع احادیث کا مطلب تو یہی ہے کہ داڑھی کو اپنی طبعی حد تک پہنچنا چاہیے نہ اس میں منڈانے کی گنجائش ہے نہ قصر فاحش کی۔ بلکہ یہ سبزہ اپنی طبعی رفتار سے بڑھنا چاہیے اور اسے چہرے کی زینت رہنا چاہیے۔

جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے کوئی حدیث منڈانے یا کترانے کے جواز میں میری نظر سے نہیں گزری۔

جامع ترمذی میں ایک حدیث بواسطہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ بایں الفاظ مروی ہے ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یأخذ من لحیتہ من عرضھا وطولھا۔ (ترمذی مع تحفہ ج۴ ص۱۱)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی کے طول وعرض سے کچھ بال لے لیا کرتے تھے۔ یہ حدیث بشرط صحت پراگندہ بالوں کی دلیل ہو سکتی ہے۔ لیکن حدیث میں کئی وجوہ سے کلام ہے۔

۱۔ حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ایسی نہیں جس سے بصورت انفراد کوئی حکم ثابت ہو سکے۔
۲۔ اگر اس میں نکارت نہ بھی پائی جائے تو بھی صحیحین کی احادیث اس کے خلاف ہیں۔
۳۔ اس کی سند میں عمر بن ہارون راوی ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں ان کی یہ روایت بالکل بے اصل اور منکر ہے۔

۴۔ عمر بن ہارون منفرد ہیں اور ان کا کوئی متابع نہیں۔
۵۔ عمر بن ہارون تفرد کے علاوہ ضعیف ہیں۔ عبدالرحمن بن مہدی امام نسائی فرماتے ہیں۔ یہ متروک الحدیث ہیں۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کذاب اور خبیث ہے۔ ابوداؤد فرماتے ہیں ثقہ نہیں۔ ابن مدینی اور دارقطنی فرماتے ہیں سخت ضعیف ہے۔ (میزان الاعتدال تقریب)
ایسی روایات سے نہ کوئی مسئلہ ثابت ہو سکتا ہے اور نہ ہی ترجیح دی جا سکتی ہے۔

شعار المشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے خالفوا المشرکین اس کی تفسیر میں مجوس اور یہود دونوں کا ذکر آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین میں منڈانے اور کترانے کی دونوں عادتیں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کے لیے حکم فرمایا بلکہ تاکید فرمائی کہ ہم اپنی وضع ان سے جدا رکھیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ فانھم کانوا یقصون لحاھم ومنھم من کان یحلقھا (فتح ج۱۰ ص۲۷۲)
ایک قوم نے داڑھی منڈانا شروع کیا اور یہ مجوس سے زیادہ برے ہیں کیونکہ وہ کتراتے تھے۔

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ مشرکین عموماً کترانے کے عادی تھے۔ منڈانے کا زیادہ رواج حافظ ابو شامہ کے زمانہ میں ہوا۔ مجوس میں منڈانے کی عادت کم تھی گویا حدیث خالفوا المشرکین میں کترانے کو برا سمجھا گیا ہے اس کے باوجود یہ دونوں فعل ناجائز ہیں اور ممنوع۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین میں قصر فاحش کا رواج تھا۔ اسی سے بعض سلف نے قبضہ کو قصر کی آخری حد سمجھا۔ اس سے کم کرنا مشرکین کی مشابہت ہے جس سے حدیث میں بصراحت روکا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ مشرکین کی وضع اور زی کے سخت مخالف تھے۔ جیسے کہ ان کے مکاتیب سے واضح ہے۔

کیونکہ جب اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی فرماتا ہے تو پھر وضع کا شعبہ اس رہنمائی سے کیوں محروم ہو۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں۔

قصو اللحیۃ من صنع الاعاجم وھو الیوم شعاد کثیر من المشرکین کالافرنج و الھنود ومن الا خلاق لہ فی الدین من الفرق الموسومۃ بالقلندریۃ (مجمع البحار ج ۱ ص ۲۷۹)

داڑھی کٹانا اکثر فرنگیوں اور ہنود مشرکوں کی عادت ہے۔ اور ایک بے دین فرقہ قلندریہ کا بھی یہی شیوہ ہے۔

جب مشرکین میں قصر کا رواج زیادہ تھا تو منڈانے کے ساتھ کترانا بطریق اولیٰ ممنوع ہو گا۔ مجوزین قصر کے نزدیک اس چیز کا خیال رکھنا ضروری ہو گا۔ کہ قبضہ سے کم نہ ہو کیونکہ یہی قصر فاحش ہے جو مشرکین کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشابہت سے روکا۔

اگر قصر کا معیار ہر شخص کی صوابدید کو قرار دیا گیا تو حدیث خالفوا المجوس بالکل بے مقصد رہ جائے گی۔ آخر وہ کون سا قصر ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور حدیث نہی کا انطباق قصر کے کون سے افراد پر ہو گا۔ حضرات قارئین سنجیدگی سے تحدید قصر پر غور فرمائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت صحیحہ کے بعد جہاں تک عمل و اعتقاد کا تعلق ہے کسی دوسرے شخص کی طرف توجہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم صحابہؓ کے مقام کی رفعت معلوم ہے ان کے اعمال وارشادات تسکین قلب میں اضافہ کا موجب ہیں۔ اس لیے مذاہب صحابہؓ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ عن جابرؓ کنا نعفی السبال الا فی حج وعمرۃ (ابوداؤد مع بذل المجھود ج ۵ ص ۷۹)

حج اور عمرہ کے سوا ہم داڑھی کے بال بڑھایا کرتے تھے۔

سبال سبلہ کی جمع ہے۔ شوارب کے آخری بالوں کو بھی کہا جاتا ہے اور سامنے کے بالوں کو بھی جو سینہ پر پھیلاتے ہیں (مجمع البحار ج ۲) یہاں دوسرا معنیٰ مراد ہے۔ الفاظ حدیث سے جمہور صحابہ کے دائمی عمل کا پتہ چلتا ہے کہ ان میں کٹانے کا رواج نہ تھا بلکہ سب بڑھایا کرتے تھے۔ قرین قیاس بھی یہی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً لفظاً صحت کترانا ثابت نہیں۔ نواب صدیق حسن فرماتے ہیں۔

حضرات عمرؓ و عثمانؓ لیکن عمر و عثمان رضی اللہ عنہم را ریش دراز زاید بر قبضہ بود و ایں ناظر در ارسال است ولہذا فقہاء ارسال را مباح داشتند و حلیہ مبارکہ نبویہ آمدہ کث اللحیۃ بملاء الصدرہ یعنی

حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علی کی داڑھیاں قبضہ سے زیادہ تھیں۔ یہ ارسال کی دلیل ہے۔ اس سے فقہاء نے ارسال کی اجازت فرمائی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ میں مرقوم ہے کہ حضرتؐ کی

انہوں نے لیش کہ پر مسکیرد سینہ را الخ (ہدایۃ السائل ص۱۲) | داڑھی سینے پر چھائی ہوئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ وہ حج اور عمرہ سے جب فارغ ہو کر احرام کھولتے تو داڑھی کے زائد بال کٹوا دیتے۔ وکان ابن عمر اذا حج او اعتمر قبض علی لحیته فما فضل اخذه (الجامع الصحیح ص۲۷۲ ج۱ ایضاً زرقانی مع المؤطا) صحابہ عموماً اور عبداللہ بن عمرؓ خصوصاً اتباعِ سنت میں مشہور ہیں لیکن ان کا یہ فعل سنتِ صحیحہ کے خلاف ہے۔

۱۔ اس لیے کہ موقوف آثار سننِ صحیحہ سے متعارض نہیں ہو سکتے۔

۲۔ صحابہؓ کا اجماع یا جمہور صحابہ اگر عملاً کسی سنتِ صحیحہ کے خلاف ہوں تو حدیث کے مطلب پر غور کی ضرورت ہے لیکن افراد کے اختلاف میں سنتِ صحیحہ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ پیشِ نظر مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔

۳۔ عبداللہ بن عمرؓ حدیث اعفاء لحیہ کے راوی ہیں۔ آئمہ حدیث اور جمہور آئمہ اسلام کے نزدیک مرفوع صحیح حدیث ہی معمول بہا ہو گی (خلافاً لجمهور الحنفية) امام شوکانی فرماتے ہیں۔

ولا يضره عمل الراوي بخلافه خلافا لجمهور الحنفية وبعض المالكية لانا متعبدون بما بلغ الينا من الخبر ولم نتعبد بما فهمه الراوي ولم يات من قدم عمل الراوي على روايته بحجة تصلح الاستدلال (ارشاد الفحول ص۵۳ کتاب الاحکام ابن حزم)

راوی کا عمل حدیث کے خلاف حدیث کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا (خلافاً للحنفیہ) ہم اتباعِ حدیث کے پابند ہیں فہمِ روایت کے پابند نہیں۔ جو لوگ عملِ روایت کو مقدم سمجھتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

۴۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ابن عمر صرف حج یا عمرہ ہی میں ایسا کرتے تھے (زرقانی ص۲۵۱) جامع صحیح میں بھی یہ تخصیص موجود ہے۔ جہاں یہ تخصیص نہیں ممکن ہے تصرف رواۃ سے ایسا ہوا ہو۔

۵۔ سابقہ گزارشات ظاہر معنی کی بنا پر تھیں۔ اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ داڑھی کے پراگندہ بالوں کو اطرافِ لحیہ سے پکڑ کر درست فرما دیا کرتے تھے۔ اس اثر میں قبضہ سے مراد پیمائشی قبضہ نہیں جیسے قرآن میں ہے۔ ثم قبضناه الینا قبضا یسیرا یہاں قبض بمعنی اخذ آیا ہے۔

وانکر ابن التین ظاهر ما نقل عن ابن عمر فقال ليس المراد انه كان يقتصر على قدر القبضة من لحيته بل يمسك عليها فيزيل ما شذ منها فيمسك من اسفل ذقنه باصابعه الاربعة (فتح الباری ص۲۷۳ ج۱)

ابن عمرؓ کا یہ منشاء نہیں کہ قبضہ سے زائد داڑھی کاٹ دی جائے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ذقن کے نیچے کے بال چاروں انگلیوں سے پکڑ کر کاٹ دیا کرتے تھے یعنی پراگندہ بال طول و عرض سے لے لیا

کرتے تھے۔

یہ معنی احادیث صحیحہ سے متعارض نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا جذبہ اتباعِ سنت اسی معنی کا مقتضی ہے جذبہ اتباعِ سنت سے، خلافِ سنت کو سنت ثابت کرنا مضحکہ خیز استدلال ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ کے داڑھی کتروانے سے اگر کترانا سنت ہو سکتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کا حکم اور عمل داڑھی بڑھانا سنت نہ ہوگا۔ آیا عبداللہ بن عمر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سنت کی محبت زیادہ تھی العجب

تفردات صحابہ رضؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحتہً کوئی سنت ثابت ہو تو صحابہؓ کے اختلاف سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا شغف بالسنۃ سنتِ ثابتہ کے خلافِ استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ صحابہؓ سنت کے عاشق تھے۔ ان کا عمل اسی صورت میں دلیل ہو سکتا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحتہً اس باب میں کچھ ثابت نہ ہو۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت آجائے تو اصل سنت وہی ہوگی۔ بعض صحابہ بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تعداد ثابت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نے ایک دفعہ کی تین طلقات کو ایک سمجھا حضرت عمرؓ نے انہیں تین ہی نافذ فرمایا (مسلم)، حضرت عمرؓ متعۃ الحج کو ناپسند کرتے تھے (مسلم)

عروہ بن زبیر لڑکا ہو یا لڑکی ایک ہی بکری کافی سمجھتے تھے (مؤطا مع زرقانی ص ۹۸ جلد ۳)

عبداللہ بن عمرؓ بھی عقیقہ میں عروہ بن زبیر سے متفق تھے (زرقانی ص ۹۸ ج ۳)

ابراہیم بن حارث چڑیا کے ساتھ عقیقہ جائز جانتے تھے (مؤطا ص ۹۸ جلد ۳)

عبداللہ بن مسعودؓ رکوع میں تشبیک کے قائل تھے۔ حالانکہ سنتِ صحیحہ اس کے خلاف ہے (ترمذی وغیرہ)

بعض صحابہ مرغی اور انڈے تک کی قربانی جائز جانتے تھے۔ (محلی ابن حزمؒ)

حضرت عائشہ رضؓ عورت کی ولایت کو جائز سمجھتی تھیں۔ والحدیث علی خلافہ

ایسے مسائل میں صحابہ کے عمل سے سنت ثابت نہیں ہوگی اور نہ ہی صحابہؓ پر طعن کیا جائے گا۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ جنگِ جمل اور جنگِ صفین نے اسی حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔

حضرت عمرؓ اور ابوہریرہؓ حضرت عمرؓ کا ایک اثر فتح الباری میں مجملاً آیا ہے۔ حافظ احمد اللہ نے اسے طبری کے حوالہ سے ذکر فرمایا ہے اور سند نہیں لکھی۔ عمدۃ القاری نے اس کی تھوڑی سی تفصیل فرمائی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو دیکھا اس کی داڑھی بہت لمبی اور پراگندہ تھی۔ آپ نے اس کی داڑھی کاٹ دی۔ علامہ عینی نے یہ روایت بصیغہ تمریض ذکر فرمائی ہے۔ امام احمدؒ نے مسند عمر میں اس کا ذکر نہیں فرمایا۔

یوں بھی اس کا تعلق پراگندگی کے ساتھ ہے اس میں داڑھی کے چھوٹے یا بڑے ہونے کا ذکر بالاصالت نہیں حضرت عمرؓ کا مقصد یہ ہے کہ گندا نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت داڑھی کٹانے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ سنت کے مطابق داڑھی بڑھاتے تھے۔ حضرت عمرؓ اگر اسے گندا نہ دیکھتے تو کٹانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمرؓ کی ریش مبارک بھی قبضہ سے زیادہ تھی۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ قبضہ سے زیادہ کتراد یا کرتے تھے۔ یہ اثر بھی بے سند ہے اور محدثین نے اس قسم کے آثار پہ اعتماد نہیں فرمایا۔ نہ ہی ان کی اسانید کے متعلق کوئی ذمہ داری لی ہے۔

اگر صحیح سند سے ان کا ثبوت مل بھی جائے تو احادیث سے تعارض کی صورت میں صحیح احادیث کو ترجیح دی جائے گی۔

ایک مرسل روایت کا ذکر صاحب اتحاف النبلاء نے بحوالہ فوائد ابن قیمؒ ذکر فرمایا۔ ابن قیمؒ کی فوائد اور بدائع الفوائد چھپ چکی ہے۔ ان میں ایسی کوئی حدیث نہیں ملی۔ ویسے ہی یہ روایت بواسطہ ابوصالح السمان (ذکوان)، مرقوم ہے۔ ابوصالح اوساط تابعین سے ہیں ۱۰۱ھ میں انتقال فرمایا اس لیے حدیث مرسل ہوگی۔ مرسل کی حجیت آئمہ حدیث اور اہلِ حدیث کے نزدیک معلوم ہے جن صحیح روایات کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں آثار و مراسیل کا یہ مختصر اور مشکوک ذخیرہ ان کے مقابل معرضِ حجت میں نہیں آسکتا۔

موجودہ فیشن جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا تعلق ہے حلق اور قصرِ فاحش معصیت ہیں اور کبیرہ گناہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح احکام کی مخالفت۔ تعجب یہ ہے کہ عوام کی بدعملی کے سبب اکثر پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اس میں تاویل شروع کر دی اور عوام کی خوشنودی کے لیے تاویل اور تجہیل کا افتتاح فرما دیا تاکہ عوام میں ان کی روشن خیالی کا چرچا ہو۔

مشرکین مجوس میں قصرِ فاحش کا عام رواج تھا اور خالفوا المشرکین فرما کر اسی قصر سے روکا گیا۔ اگر قصر کی تحدید شرعاً نہ کی جائے تو حدیث اعفوا اللحیٰ بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ جنس اعفاء توقصر اور حلق کی ہر صورت میں پائی جاتی ہے۔ جب تک مشرکین کے قصر کو سمجھ نہ لیا جائے اس کی کوئی صورت ذہن میں نہ آجائے۔ ان کی مخالفت کا بھی کوئی مقصد نہیں ہوسکتا۔ حدیث خالفوا اور حدیث اعفاء صرف ایک قضیہ مفروضہ ہو کر رہ جائیگی۔ اس مقام پر عوام کے ساتھ بعض اہلِ علم بھی مبتلا ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مقام کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔ لیہلك من هلك عن بينة ويحي من حي عن بينة۔

مذکرہ دونوں صورتیں قطعی طور پر خلافِ سنت ہیں۔ ترکِ سنت چونکہ کفر نہیں اس لیے عموماً مجلسی طور پر اسے گوارا کیا جاتا ہے اور شاید اسی وجہ سے یہ معصیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس تساہل کو جواز و اباحت کی دلیل نہ سمجھا جائے۔ ہمارے معمولات میں اس قسم کی چیز حقہ ہے۔ اس کی حرمت میں بعض اہلِ علم کو تامل ہے لیکن اس کی مضرت میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کا غیر مفید ہونا قریباً مسلّم ہے۔ اور سوسائٹی میں اس کا استعمال اس کثرت سے ہے کہ بعض وقت سوسائٹی کی ذہنی افتاد پر افسوس ہوتا ہے۔ تاہم کثرتِ استعمال اور اس بلیہ کے عموم کو اس کے جواز یا استحسان کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اصحابِ عزیمت کا فرض ہے کہ معاشرہ میں ایسی خرابیوں کے وقت اصلاحِ حال کی پوری کوشش فرماویں۔

بلیک مارکیٹ، ذخیرہ اندوزی، منافعہ بازی سود کی بعض صورتیں ہمارے معاشرہ میں عام ہو رہی ہیں۔ رشوت، کنبہ پروری ہمارے ذمہ دار طبقہ کا عام روگ ہے لیکن اسے جواز یا اباحت کی دلیل نہیں تصور کیا جا سکتا۔ زیرِ قلم مسئلہ ہی کو دیکھیے آپ اس کے خلاف کہیں تو لوگ تعجب انگیز نگاہوں سے آپ کی طرف دیکھیں گے لیکن یہ جواز کی دلیل نہیں قرار دی جا سکتی۔

۳۔ بعض لوگ قبضہ سے زائد کٹوا دیتے ہیں جس کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے اثر سے استدلال کیا گیا۔ آثار کی بحث بلحاظ ثبوت پہلے گزر چکی ہے۔ نواب صدیق حسنؒ فرماتے ہیں۔

ہمچنیں حکایت ایں فعل بعض اہلِ علم از جماعتے از تابعین واستحسانش از شعبی وابنِ سیرین نقل کردہ اند۔ ومذہب ابوحنیفہؒ وابویوسفؒ ومحمدؒ نیز ہمیں است کہ طولِ لحیہ بقدرِ قبضہ باید وقطع مادراد آں واجب است (ہدایۃ السائل صـ۱۲)	"تابعین کی ایک جماعت کا بھی یہی خیال ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کا بھی یہی مذہب ہے کہ قبضہ سے زائد کٹا دینا ضروری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ میں کوئی حدیث منقول نہیں۔ کٹانے کے باب میں یہی حد ہے جسے فعلِ صحابہؓ کی بنا پر مباح کہا جا سکتا ہے کو عام صحابہ کا عمل اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت جابرؓ کا اثر بروایۃ ابوداؤد پہلے گزر چکا ہے۔

۴۔ داڑھی کے طول وعرض سے بکھرے ہوئے بال کترا دینا یہ صورت درست ہے اور حدیثِ اعفاء کے خلاف بھی نہیں۔ سننِ ابنِ ماجہ میں اصول کے طور پر اس کا ذکر آیا ہے۔

باب کراھیۃ الشعر عن وائل بن حجر قال رأنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولی شعر	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بال لمبے لمبے دیکھے تو فرمایا یہ ڈمیں کیسی

طویل فقال ذباب ذباب فانطلقت فاخذته فرآنی فقال انی لم اعنك وھذا احسن
(ابن ماجہ اصح المطابع ص۲۶۷)

ہیں۔ میں نے جاکر بال کٹوا دیئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا لیکن یہ بہتر ہے۔

حضرت عمرؓ کے اثر کا مفاد بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور وائل بن حجر کی حدیث کا ضعف کے باوجود اسی قدر مفاد ہے۔ ابنِ عمرؓ کے اثر کا جو معنی ہم نے پہلے لکھا ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ احادیثِ اعفاء اور آثارِ قطعِ لحیہ میں اس سے تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

تجمل کے نقطۂ نظر سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسئلہ میں حسن کے نقطۂ نظر سے بھی گفتگو ہونی چاہیے۔ لباس کے معاملہ میں شارع نے اسے کافی حد تک ملحوظ رکھا ہے ان اللّٰہ جمیل و یحب الجمال سے اس اصل کا پتہ چلتا ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر اگر بحیثیت مسلمان بحث کی جائے تو تجمل کی صحیح صورت تو وہی ہو گی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا لیکن اگر عشق کی طغیانیاں اور حسن کی سرمستیاں کسی ساحلی تحدید کی پابند نہ رہ سکیں تو اتنا تو سوچنا پڑے گا کہ حسن و تجمل کے لیے دنیا کے پاس کوئی قطعی قانون تو ہے نہیں یہ بالکل وقتی اور اضافی چیز ہے۔ متمدن شہروں میں فیشن ہفتوں کا مہمان ہوتا ہے اس لیے مصنوعی حسن و تجمل کی تلاش میں حسنِ سازج کی حدود کو پھاندنا مناسب نہیں۔ حسن و تجمل کو جزوی حیثیت ہی دی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے قدرت کے اٹل قانون سے پیہم جنگ کوئی خوشگوار مشغلہ نہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یوں سمجھیے کہ آغازِ سبزہ سے جو جمالیاتی کیفیت اس لیل و نہار کے اجتماع میں پائی جاتی ہے اور نگاہیں جس قدر حظ اس قدرتی منظر سے پاتی ہیں اسے اس مصنوعی شورہ زمین سے کوئی نسبت ہی نہیں جسے بہ تکلف تراش خراش کے بعد پوڈر اور کریم کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے۔ اس مصنوعی سپیدہ میں بالوں کی سیاہ کھونٹیاں گویا حسن کی سیاہ قبریں ہیں جو اس کے ماتم کی زندہ اور جاوید دعوت ہے۔ عوام کا ذوق ویسے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن استدلال و بحث کے مقام پہ تو عوامی رجحانات کی کوئی قیمت ہی نہیں اور حسن کی اس ریاکارانہ نمائش میں عوام کے عامیانہ جذبات کے سوا کچھ بھی نہیں جس پہ ایک عقلمند فکر کرسکے یا سوچنے کی تکلیف کرے۔

بڑھاپے میں جب کہ جمال و تزئین کا چراغ طلوعِ سحر کا پتہ دے رہا ہو۔ چہرے کی جھریاں بکھر کر قیافہ کی پریشانیوں کی غمازی کر رہی ہوں چند بالوں کی پریشانی سے پریشان ہو کر موسیٰ و مقراض کی دیوانہ وار احتیاج صرف پریشان خیالی ہی نہیں بلکہ عقل کی پراگندگی کا بھی پتہ دیتی ہے۔

اور جب چہرہ قدرتی جمال کی رعنائیوں سے سرشار ہو، جوانی کی سج دھج پورے جوبن پہ ہو تازہ خون کی

سیلاب آمیز موجیں چہرے پر مچل رہی ہوں۔ ان قدرتی عساکر کو حضری اور مصنوعی اسلحہ سے مسلح کرنا تحصیل حاصل ہے۔ سچ جانیئے کہ یہاں تو بالوں کی پیچ پیچ پراگندگیاں چہرۂ دلآرام پر مشاطہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج کی یہ پریشانی اور ان سیاہ ناگوں کے پیچ بل اور بے ترتیب پریشانی حسن وجمال کی آخری معراج ہے۔ اس پریشانی کی حفاظت کے لیے عاشق اور شاعر شانہ سے بر سرپیکار ہیں۔ کہ وہ اس پریشانی کو پریشانی سے بچانے کے لیے ...... کس دعویٰ سے کہا جاتا ہے ؎ حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را۔

کتنا ظلم ہوگا شانہ کے ساتھ اس کھلی جنگ کے بعد حسن کا تمام اثاث البیت استرے اور قینچی کی نذر کر دیا جائے ایسے حسن پرستوں سے حسن کی یہ فریاد کس قدر برمحل ہوگی۔ ؎ چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی۔

یہاں یورپ کی تقلید کا جنون اس قدر سوار ہے کہ اگر کہیں پیرس کی آوارہ مزاج حسن بدوش لیڈیوں نے سر منڈانے کا فیصلہ کر لیا تو یہاں بلا تأمل آمین کہہ دی جائے گی اور عورت کی چوٹی اور مرد کا چہرہ دونوں پاش پاش ہوتے نظر آئیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ ان ماہرانِ جمالیات کی متاعِ گراں بہا تقلیدِ یورپ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم ایسے قدامت پسند تقلید ونقل کی ان زنجیروں کو کیونکر توڑ سکتے ہیں۔

مجھے حسنِ مصنوع سے عداوت نہیں۔ جہاں تک فطرت کی سادگی کا تعلق ہے یہ بال ایک نوجوان چہرے کی عصمت وآبرو ہیں۔ اس پرنائی کو دست درازی کا کوئی حق نہیں۔ اس آبرو کو پامال کرنا معصوم فطرۃ پر ایک ظلم ہے۔ جہاں تک اس موضوع کا فطرت کی صنعت کاری سے تعلق ہے میں نے جو عرض کیا وہ قطعی صحیح ہے۔ اور اگر اختلاق وتصنع پر ہی اصرار ہے تو ہر صناع وحراف کو حق ہے کہ اپنی رائے پر اعتماد کرے اور وہ آزاد ہے کہ قدرت کے پیدا کردہ حسن میں جو تحریف وتبدیل کر سکتا ہے کر گزرے۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

الاعتصام۔ ۱۰ فروری ۵۰ء

" " ۱۷ "

" " ۲۴ "

اہلِ حدیث کی اقتداء

رمزوان لاہور، مورخہ ۲۸ مارچ ۵۱ء کے نماز نمبر میں بعض اختلافی مسائل کا تذکرہ مزاحیہ انداز میں "گل وخار" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ سنجیدہ مزاح بری چیز نہیں لیکن دینی مسائل میں مزاح اچھی چیز نہیں ہے بلکہ قرآن نے اسے جہالت قرار دیا ہے۔ اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین۔

معلوم نہیں ادارہ رضوان نے دینی مسائل میں یہ طریق کیوں اختیار کیا ہے۔ غالباً دلائل کی تنگ دامانی نے ان کو یہ طریق اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔

رضوان رضاخانی احناف کا ترجمان ہے۔ یہ حضرات فہم مسائل میں فقہ حنفیہ سے کہیں زیادہ اعتماد مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے طریق فکر پر رکھتے ہیں۔ فقہ حنفیہ کے ساتھ ان کا تعلق محض عوام کے ساتھ رابطہ کی بناء پر ہے ورنہ حضرت امام والامقام کے علم و تفقہ سے انہیں چنداں دلچسپی نہیں۔ جہاں اجتہاد کی طغیانی کا یہ عالم ہو کہ عقائد کے اثبات میں قیاس سے کام لیا جاتا ہو بلکہ نصوص قطعیہ کو نظر انداز کرنے میں بھی پرہیز نہ ہو وہاں حضرت امامؒ کے طریق فکر کی کیا وقعت ہے۔ اور جہاں اثبات عقائد میں ظنیات سے پرہیز ہے اور اخبار احاد جیسی واجب التعمیل نصوص میں بھی احتیاط کا دامن چھوٹنے نہ پایا ہو رحمہ اللہ و رضی اللہ عنہ وعن سائر الائمۃ المجتہدین والفقہاء والمحدثین الذین ہم قادۃ الدین وہاں مقاییس اور اوہام کی اس بے اعتدالی اور طغیانی کا پیوند کیونکر لگ سکتا ہے۔

اکل حلال کی جہاں اس قدر پابندی ہو کہ مقروض کی دیوار کے سایہ سے استفادہ کرنے میں احتیاط پیش نظر رہی ہو وہاں اس حنفیت کا جوڑ کیوں کر لگے گا جس میں جمعرات کی صبح ہی سے مسجد کے درودیوار پر ٹکٹکی بندھ جائے کہ حلال و حرام سے پیٹ کا دوزخ بھر لیا جائے۔ جہاں بھینس اور اس کی کٹیا کی بیماری پر عرس و میلاد کی نذریں ماننے کی تلقین ہوتی ہو۔ پیٹ کی پہنائی شب بھر سے میلوں دراز ہو امام ابو حنیفہؒ ایسے بے طمع آدمی سے ان کا تعلق کہاں تک قائم رہ سکتا ہے۔ کہاں جیل کی صبر آزما موت اور کہاں کوتوالیوں کے طواف؟

لیکن چونکہ اہل حق پر طعن کے لیے فقہ حنفی کی آڑ لی گئی ہے اور فقہی فروع کو بہانہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اس لیے ارباب توحید ہمیں اس طریق گفتگو میں معذور تصور فرمائیں۔ مقصود اسی طریق فکر کی وضاحت ہے جسے اہل حدیث اور دوسرے آئمہ سلف نے ترجیح دی ہے۔ لیکن ادارہ رضوان نے اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ کسی پر طعن مقصود ہے نہ تنقید ؎

گفتگوئے عاشقاں در باب رب ۔۔۔ جذبۂ عشق است نے ترک ادب

وہابی مدیر رضوان نے اس ہمز و لمز کے لیے وہابی کا لقب اہل حق کے لیے اختیار کیا ہے اللہ کا شکر ہے کہ اس سب و شتم کا دھارا خود بخود ہی کسی اور طرف پھر گیا ہے اور اہل حق اس بے ہودہ گوئی سے محفوظ ہو گئے۔ کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام کیف یصرف اللہ عنی شتم قریش یسبون مذمما وانا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ؎

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

یہاں بحمداللہ نہ کوئی وہابی ہے نہ نجدی، نہ حنفی ہے نہ سہروردی، ان وقتی اور اختراعی نسبتوں سے نہ محبت ہے نہ نفرت، نہ کسی سے عشق ہے نہ بغض۔ حقیقت اس قدر ہے کہ کتاب اللہ اور سنت سے وابستگی ہے، وہ بھی اس انداز سے کہ اس کے ردو قبول میں کسی غیر نبی کو کوئی معیاری اہمیت حاصل نہیں۔ کوئی طریق فکر ذہن پر محیط نہیں جس کی پابندی کتاب و سنت کے فہم میں حائل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ارشادات گرامی سے تعلق کی نوعیت ایسی ہے کہ اس میں کسی ایسے واسطے کی گنجائش نہیں جسے فسق و تقویٰ یا کفر و اسلام کا معیار قرار دیا جائے۔ فکر و نظر، استنباط و استدلال کے لحاظ سے تمام آئمہ ہدیٰ اور اسلاف امت سے استفادہ خدا تعالیٰ کی نعمت ہے جس کا کبھی انکار نہیں ہوا۔ آج جس قدر علوم و معارف موجود ہیں تمام ان آئمہ فقہ و حدیث کا فیضان ہے جس کا شکریہ ہم پر فرض ہے اور ہر وقت دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پاکباز اور مقدس بزرگوں کی قبروں کو رحمت سے بھر دے۔

مدیر رضوان نے بڑا کرم فرمایا کہ جس قدر کفر کا ذخیرہ ان کے دل میں موجود تھا اسے ظاہر نہیں فرمایا بلکہ اہل سنت والحدیث کی اقتدا سے روکنے پر کفایت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کتمان کفر کی جزا عنایت فرمائے لیکن یہاں ان کے کفر سے گھبراہٹ نہیں بلکہ ان کے مصنوعی ایمان سے، کیونکہ بریلوی اور رضائی ایمان سے کفر شاید حقیقت ایمان ہے۔ مدیر رضوان کی حنفیت کا آغاز قریباً مولوی احمد رضا خاں بریلوی سے ہوا اور ہمارے ایمان کا آغاز آنحضرت فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

اگر ایسے حضرات ہماری مساجد میں تشریف نہ لائیں تو ہمیں کوئی شکایت نہ ہوگی اور ہم سے حلف موکد لیجئے کہ ہم آپ کو اپنی اقتداء کے لیے کبھی دعوت نہیں دیں گے اور شاید گزشتہ سالوں میں بھی کبھی نہ دی ہوگی۔ ہماری مساجد بحمداللہ اس گئے گزرے دور میں بھی آپ کی اکثر مساجد سے زیادہ آباد ہیں۔ یہاں اہل توحید کی بحمداللہ اتنی کثرت ہے کہ حضرات اہل بدعت اور عباد القبور کی ضرورت ہی نہیں۔ یوں بھی اہل سنت جس طمانیت سے نماز ادا فرماتے ہیں آپ کو ان کی اقتداء ویسے ہی گراں پڑے گی۔ اس لیے ہماری یہ رائے ہی نہیں مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ کسی اہل سنت کی اقتداء نہ فرمائیں یہی بہتر ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے لا یقبل اللہ صاحب بدعۃ صرفا ولا عدلا یعنی بدعتی کے فرض اور نفل دونوں اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ ایک غیر مقبول نماز کی امامت سے ہمیں کیا حاصل ہے؟ اس لیے آپ اگر اہل توحید کی اقتداء نہیں فرماتے تو اطمینان رکھیے کہ یہاں

سے بھی کوئی پیغام بھیجنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ ؎

پیش آنکس بہ و کہ خریدار تست

دلائل البتہ اِن دلائل کے متعلق گزارش کرنا جن سے عوام کو مغالطہ ہو سکتا ہے ہمارا فرض ہے محترم رضوانی صاحب نے اہل حدیث کی اقتداء کے ناجائز ہونے میں پانچ مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔

حضرت مجدد الوقت مجتہد العصر مولانا الشیخ سید نواب صدیق حسن خاں صاحب کی کتاب "الروضۃ الندیہ" کے کسی اردو ترجمہ سے استفادہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

"پانی کتنا ہی کم ہو، نجاست پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک رنگ یا مزہ یا بو نہ بدلے۔"

فتویٰ سنیئے، سوچیے یہ لوگ ایک لوٹے پانی میں، ایک قطرہ پیشاب گر جائے تو اس کو پاک کہتے ہیں اور اس سے وضوء کر کے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بتائیے ہماری نماز ایسے پانی سے وضوء کے ساتھ کیسے ہو سکتی ہے۔

اب ہماری گزارشات سنیئے:۔

۱۔ درر بہیہ کے نام سے نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کی کوئی کتاب نہیں۔ البتہ امام شوکانیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی اس نام کی ایک کتاب ہے جس پر نواب صاحب مرحوم نے شرح لکھی ہے۔

۲۔ آئمہ متفق ہیں کہ رنگ، بو، مزا اگر نجاست کی وجہ سے بدلے تو پانی پلید ہو جائے گا۔ پانی کم ہو یا زیادہ بہر حال ایسا پانی پلید ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں اگر قلتین ہو یا اس سے زیادہ اس میں اگر نجاست گرے تو جب تک اوصاف ثلثہ (رنگ، بو، مزہ) نہ بدلے پانی پاک ہوگا۔ کیونکہ یہ کثیر پانی ہے نجاست کے اثر کو قبول نہیں کرتا۔

احناف کا مسلک یہ ہے کہ اگر عشر در عشر ہو یعنی دہ در دہ وہ ماء جاری ہے یا ماء کثیر کے حکم میں ہے۔ اس میں نجاست کا اثر نہیں ہوگا۔ پانی پاک رہے گا۔ جب تک نجاست رنگ، بو، مزہ کو نہ بدل دے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ تھوڑے یا زیادہ پانی کی کوئی قید نہیں۔ اصل چیز اوصاف کا تغیر ہے جب تک رنگ بو اور مزہ نہ بدلے پانی کم ہو یا زیادہ اس پر نجاست کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

قال محی السنۃ التقدیر بعشر فی العشر لا یرجع الی اصل شرعی یعتمد علیہ (شرح الوقایہ ج ۱ ص ۵۹)	محی السنۃ فرماتے ہیں دہ در دہ کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔

مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

والتقدیر الذی ذکرہ الحنفیۃ فی علام سراننا	حنفیہ نے جو دہ در دہ کا اندازہ

النجاسة الی العشر فی العشر لیس له اصل شرعی بخلاف تقدیر الشافعیة بالقلتین فانه ثابت بالحدیث الصحیح وکذا التقدیر المالکیة بالتغیر (عمدۃ الرعایۃ ص۸۵)

ماءِ کثیر کے لیے فرمایا ہے اس کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں لیکن شافعیہ نے جو قلتین کا اندازہ فرمایا ہے وہ صحیح حدیث سے ثابت ہے اسی طرح موالک کا اندازہ تغیرِ اوصافِ ثلثہ بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

مولانا رضوی "وہابیوں" پر اس لیے ناراض ہیں کہ وہ پیشاب کے ایک قطرہ سے پیالہ کو پلید نہیں سمجھتے۔ ایسے پانی سے اگر وضوء کیا جائے تو رضائی حنفیوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

او بایہ گزارش ہے کہ اگر دو مشکوں میں ایک پیالہ پیشاب گر جائے تو جناب کی نماز کو تکلیف نہ ہوگی اور اقتداء گوارا فرمائے گی۔ یعنی قلتین کی تحدید جناب کو منظور ہے تو پھر "وہابیوں" سے مصالحت کے لیے ایک مجلس بلالی جائے۔

۳ اگر کوئی مالکی اپنے مذہب کے موافق پاک پانی سے وضو کرے تو رضائی نماز ہوگی یا نہیں۔ اگر آپ کی نماز نہ ہونے پر بضد ہو تو چاروں اماموں کی حقانیت کا کیا مطلب ہوگا؟

۴ جوازِ اقتداء میں کوئی عقیدہ تو حائل نہیں صرف پانی ہی کی دقت ہے تو اس کا تو ایک اور حل بھی ہو سکتا ہے آپ کی مسجد کے حوض یا سبیل سے وضوء کر کے اگر وہابی امام بنے تو اس پر تو کوئی اعتراض نہیں جناب کے اس ارشاد کا مطلب میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

۵ جناب نے سنا ہوگا کہ حضرت امام ابویوسفؒ نے ایک حمام سے وضوء فرمایا جس میں چوہا مرچکا تھا تو آپؒ نے نماز پڑھ لی اور دوہرایا کہ ہم اپنے حجازی بھائیوں کے قول پر عمل کرتے ہیں کیا امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ وہابی تو نہیں تھے؟

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے حدیثِ قلتین کو صحیح قرار دیا ہے حالانکہ اس کے اسناد میں جو بحث ہے وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ احناف نے اس حدیث کے متعلق جو معنوی الجھن پیدا کی ہے وہ بھی معلوم ہے پھر بھی مولانا عبدالحی مرحوم اسے صحیح فرماتے ہیں اس لیے میں انتظار کروں گا کہ اس اضطراب کو آپ ہی دور کریں۔

۵ امام شوکانی اور سید صدیق حسن خاں رحمہما اللہ تعالیٰ کا رجحان واقعی حضرت امام مالکؒ کے مسلک کی طرف ہے وہ پانی کی مقدار کو نجاست اور طہارت میں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ وہ اس کا انحصار کیفیت پر ہی فرماتے ہیں۔ پانی کم ہو یا زیادہ رنگ، بو، مزہ بدل جائے تو اسے پلید سمجھتے ہیں ورنہ ان کی نظر

ہیں وہ پانی پاک ہے اور ان کی دلیل نص حدیث ہے۔

الماء طهور لا ينجسه الا ما غلب على طعمه او ريحه او لونه الا کے بعد جو زیادہ ہے وہ زیادہ ہے وہ باتفاق محدثین ضعیف ہے لیکن اس کی تائید اجماع ائمہ سے ہے اس لیے امام مالکؒ، امام شوکانیؒ اور نواب صدیق حسن خانؒ کی تائید میں نص صریح صحیح بھی اور اجماع بھی ہے پانی کی طہارت صریح اور صحیح نص سے ثابت ہے اور زیادہ کی تائید اجماع سے، رضائی حضرات شائد نہ جانتے ہوں۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ حدیث الماء طهور لا ينجسه شيئ بروایت ابو سعید خدری، ابوداؤد احمد، ترمذی میں موجود ہے۔ امام ترمذی اسے حسن فرماتے ہیں امام احمد فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔ امام احمدؒ کی روایت میں ہے۔ انه يستقى لك من بئر بضاعة یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بیر بضاعہ کا پانی استعمال فرماتے تھے۔ شافعیؒ، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، حاکم اور بیہقی نے اسے صحیح فرمایا۔ یحیٰی بن معین، ابن حزم اور حاکم نے بھی اس کی تصحیح فرمائی۔ ابن قطان نے اس کے بعض طرق پہ کلام کرنے کے بعد فرمایا وله طريق احسن من هذا۔ یہ حدیث احسن طریق سے بھی مروی ہے۔ ابن مندہ فرماتے ہیں اس کی سند مشہور ہے۔ ابو سعید خدریؓ کے علاوہ یہ حدیث حضرت جابرؓ، ابن عباسؓ، سہل بن سعیدؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ثوبانؓ سے بھی مروی ہے۔ اگر نواب صدیق حسن خاں نے صحیح حدیث اور اجماع کی بناء پر یہ مسلک اختیار فرمایا ہے تو آپ نے اقتداء ہی کی نفی فرمادی۔ اب اگر بریلوی حضرات نے نواب صاحب کی اقتداء چھوڑ دی تو بے چارے نواب صاحب کیا کریں گے؟

ملک اور یہ قصہ صرف نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور وہابیوں پہ ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ آئمہ سلف کی ایک متعدد جماعت کا یہی مسلک ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

والحديث يدل على ان الماء لا يتنجس بوقوع شيء فيه سواء كان قليلا او كثيرا ولو تغيرت اوصافه او بعضها لكنه قام الاجماع على ان الماء اذا تغير احد اوصافه بالنجاسة خرج من الطهورية فكان الاحتجاج به لا بالزيادة كما سلف فلا ينجس الماء بما لاقاه ولو كان قليلا الا اذا تغير وقد ذهب الى ذلك ابن عباس وابوهريرة ف الحسن البصري وابن المسيب وعكرمة وابن

حدیث سے ظاہر ہے کہ پانی کم ہو یا زیادہ کسی چیز کے گرنے سے پلید نہیں ہوتا۔ گو اس کے اوصاف بھی بدل جائیں لیکن اجماع سے ثابت ہے کہ تمام یا بعض صفات کے بدلنے سے پانی پلید ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی پلید چیز گرے۔ پس یہ استدلال اجماع سے ہے حدیث کی زیادت سے نہیں۔ پس پانی

ابی لیلی والثوری و داؤد الظاہری و النخعی وجابر بن زید و مالک و الغزالی۔ (نیل الاوطار ص۳۶ ج۱)

پلید نہیں ہوگا جب تک اس کے تین اوصاف میں سے کوئی ایک نہ بدل جائے۔ حضرت ابوہریرہؓ، حسن بصری، ابن مسیب، عکرمہ عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ، امام سفیان ثوری، داؤد ظاہری، امام نخعی، جابر بن زید، امام مالک اور امام غزالی کا بھی یہی مسلک ہے۔

محترم رضوی صاحب کو اگر فاتحہ، میلاد شریف یا عرس اور دیگر اسباب شکم پری سے کبھی فرصت ملے تو غور فرمائیں، حدیث صحیح، اجماع امت اور آئمہ سنت کی ایک بڑی تعداد نواب صدیق حسن خاں صاحب اور وہابیوں کے ساتھ ہے۔ فرمائیے ان بزرگوں کی اقتدا بھی درست ہے یا نہیں؟

ث محترم رضوی صاحب! اجتہادی مسائل میں کسی کے مسلک کا اختیار کرنا یا ترجیح دوسری چیز ہے اور مخالف مسلک کی تکفیر یا اقتدا کا عدم جواز بالکل دوسری چیز ہے۔ یقیناً تھوڑے پانی کی نجاست کے بھی بہت سے آئمہ قائل ہیں۔ پھر ماء قلیل کی تحدید میں بہت زیادہ اختلاف ہے جس میں فیصلہ کرنا تقلید کی بنا پر تو شائد ممکن ہو جائے مگر دلیل کی بنا پر سخت مشکل ہے۔ وللناس فی تقدید القلیل والکثیر اقوال لیس علیہا اثارة من العلم (نیل ص۳۷ ج۱) قلیل اور کثیر پانی کی مقدار میں لوگوں کے بہت اقوال ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔

جب ان تحدیدات کی تائیدات کتاب وسنت کی کسی نص صریح سے نہیں ہوتی تو پھر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے۔ آپ سوچیں نجس پانی کا استعمال حرام ہوگا کسی پانی کو پلید ثابت کرنے کے لیے آپ کو ایسے دلائل کی ضرورت ہوگی جو حلت و حرمت کے اثبات میں کامیاب ثابت ہو سکیں۔ ایسے اوزجو آئمہ اجتہاد میں محل اجتہاد ہیں ان کے مفہوم میں اختلاف، طریق ثبوت میں اختلاف، تعیین مقاصد میں اختلاف، ان مظنون فرقہ وارانہ دلائل کی بنا پر آپ حرمت اقتدا کا فتویٰ کس جرأت سے دے رہے ہیں۔ یہ نہ علم کی شان ہے نہ دیانت کا تقاضا۔ اس کی نہایت صرف اس قدر ہو سکتی ہے کہ جس پانی کو آپ پلید سمجھتے ہیں اسے مت استعمال فرمائیے پورے احتیاط سے اپنے مسلک کی پابندی فرمائیے لیکن نہ آپ کسی دوسرے کو مجبور فرما سکتے ہیں نہ اس پر کوئی فتویٰ لگا سکتے ہیں۔ شوافع، موالک، حنابلہ کا مقام اپنے آئمہ کے ساتھ احناف سے کم نہیں۔ عقیدہ طریق فکر، صحت مسلک کے متعلق یقین بالکل مساوی ہے اگر وہ بھی یہی روش اختیار کریں جو آپ نے اختیار فرمائی ہے تو ملت میں تفریق کی ایسی راہ کھلے گی کہ غیر مقلد آپ کا مضحکہ اڑائیں گے۔ عقل و دانش کی محفلوں میں آپ کے لیے کوئی مقام نہ ہوگا۔ پہلے ہی سے آپ کا فرقہ تنگی نظر اور فقدان فکر میں ضرب المثل ہے۔

پابندیٔ رسوم، حلوے اور چائے کی تلاش میں کافی بدنام ہے۔ مزید تفریق بین المؤمنین کی ذمہ داری لینے سے پرہیز فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو فہم صحیح کی توفیق دے۔

ف ۹ مناسب ہوگا کہ آپ کے مسلک کی بھی چھان پھٹک کر لی جائے۔ دوسرے پر حملہ کرنے سے پہلے آپ کے شیش محل کا امتحان ہو جائے کہ وہ کہاں تک مضبوط ہے جس کے سہارے پر دوسروں کی اقتدا حرام فرمائی جارہی ہے۔ وہ سہارا، سہارا ہے بھی یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احناف کا مسلک پانی کے متعلق نہ روایۃً درست ہے نہ درایۃً، نہ نصوص اس کی مؤید ہیں نہ عقل، یہ مسلک محض عوام کی عقیدتمندانہ حمایت سے چل رہا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ آپ حضرات کو اپنے مخالفین پر فتویٰ دینے کی جرأت کیسے ہوتی ہے۔

ماءِ کثیر کی تعیین عشر فی العشر یعنی دہ در دہ کا اندازہ بالکل بے ثبوت ہے۔ متأخرین حنفیہ نے یہ اندازہ گھڑ لیا ہے۔ قرآن اور حدیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ شارح وقایہ نے اسے ثابت کرنے میں جس قدر زور صرف کیا ہے اس کا اصل مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر جناب نے اسے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی تو تفصیلاً عرض کیا جائے گا۔ محی السنۃ کا قول پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ صاحب درالمختار ص۱۲۶ بھی امام محی السنۃ سے اس باب میں متفق ہیں کہ یہ تحدید ثابت نہیں بلکہ امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے بھی یہ بات ثابت نہیں ماءِ کثیر، ماءِ جاری، غدیر وغیرہ کے متعلق ائمہ احناف میں کس قدر اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا جاری پانی وہ ہے جو تنکوں کو بہا کر لے جائے۔ بعض نے فرمایا جس کے استعمال میں تکرار نہ ہو۔ اسی طرح غدیر (تالاب) کے متعلق ارشاد ہے جس کو ایک طرف سے اگر حرکت دی جائے تو دوسری طرف سے نہ ہلے لیکن حرکت غسل سے ہو یا ہاتھ سے یا وضوء سے، اس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ سے مختلف روایات ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ مسئلہ منصوص نہیں بلکہ اجتہاد و تفقہ کی پیداوار ہے اسی طرح دہ در دہ کا مسئلہ بھی متأخرین نے پیدا کر دیا۔ مولانا رضوی خود ہی سوچیں کہ اس قسم کے فقہی اختلافات کی بناء پر اقتداء سے روکنے کا فتویٰ دانشمندی نہیں۔ بلکہ جس طرح ائمہ نے ان مسائل میں اختلاف کا حق دیا ہے اور شریعت میں اپنے اجتہادات کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں فرمائی اب بھی تنگی نہ فرمائی جائے۔ بلکہ اپنے مسلک اور تحقیق کی پابندی کے بعد دوسرے فقہی اختلافات میں رواداری برتی جائے۔ بریلوی حضرات تو سارے ہی تقریباً کم ظرف ہیں، دیوبندی حضرات میں اس قسم کی کم ظرفی مولانا تھانوی اور مولانا انور شاہ رحمہما اللہ کے حصہ میں آئی تھی۔ مولانا عبدالحی لکھنویؒ کا مسلک اس باب میں زیادہ صاف اور واضح ہے۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ۔

غالباً آپ حضرات اس کی تو اجازت مرحمت فرمائیں گے کہ اگر کوئی شخص امام ابویوسفؒ یا امام محمدؒ کے مسلک کی پابندی کرے تو اس کی نماز ہو جائے گی اور اقتدا بھی درست ہی ہوگی۔ اسی طرح امام شافعیؒ، امام

مالکؒ یا امام احمدؒ بھی طہارت میں اپنے مسلک کے مطابق نماز ادا کریں یا امامت فرمائیں تو ان کی نمازوں کو بھی آپ آسمان تک پہنچانے کی فرشتوں کو اجازت دیں گے۔ آپ اگر اتنی لچک پیدا کریں تو وہابیوں کی تکرمت کریں وہ آپ کے ان وسائل سے بے نیاز ہیں۔ ان کا معاملہ براہِ راست خدا تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا اور ان کا امام شفاعت کے وقت ان کو ان شاء اللہ نہیں بھولے گا۔ اللھم صل علی محمد و بارک وسلم

۱۰ طہارت کے مسئلہ میں کوئیں اور تالاب کا فرق بھی عجیب ہے گو یا یہاں پہنچ کر پانی کی مقدار سے ظرف کی ہیئت کو پاکیزگی اور نجاست میں زیادہ دخل ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک کوئیں میں اتنا پانی ہے جس سے کئی تالاب دہ در دہ بھر سکتے ہیں لیکن جب یہ پانی تالاب میں ہو تو کوئی پلیدی اس میں اثر نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ تمام اور اس سے کئی گنا زیادہ پانی کسی گہرے اور وسیع کوئیں میں آجائے تو وہ چند تولے نجاست کا بھی متحمل نہ ہوگا۔ گویا گول برتن مستطیل برتن سے جلدی پلید ہو سکتا ہے۔ صاحبِ ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ومسائل البئر مبنیۃ علی اتباع الاثار دون القیاس (ہدایہ اولین ص۲۰) کوئیں کی نجاست میں قیاس کو دخل نہیں۔ یہ مسائل سماعی ہیں۔ پاک اور پلید کا مسئلہ حرام و حلال کے قریب قریب آیا ہے اس میں محض آثارِ صحابہ کفایت کر سکتے ہیں اور ان کی بناء پر حرمتِ اقتداء کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ آیا یہ ممکن ہے کہ ان اہم مسائل کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی مروی نہ ہو سارا معاملہ صحابہ پر چھوڑ دیا جائے۔ جو حسبِ عقیدہ اہلِ سنت معصوم نہیں ہیں اور پھر آپ ہیں کہ بے سوچے سمجھے فتویٰ دینا شروع کر دیتے ہیں ع

ما ھکذا یا سعد تورد الابل

پھر ان آثار کی اسانید پر بھی کبھی آپ نے غور فرمایا۔ شاید ہی ان میں کوئی سند صحیح طور پر صاحبِ روایت تک پہنچ سکے۔ بشرطِ صحت ان آثار کا مفاد زیادہ سے زیادہ تنزیہ ہو سکتا ہے ان کی بنا پر کوئی تشریعی حکم نہیں دیا جا سکتا لیکن آپ کے ہاں اکفار و تکفیر اور اقتداء پہ پابندیاں ایک دل لگی ہے اور ایک دل خوش کن مشغلہ ۔

والکفر عندکم رخیص سعرہ

احصوا بلا کیل ولا میزان

میری گزارش اس قدر ہے کہ یہ فتویٰ بازی ان دلائل کی بنا پر دیانۃً بھی مناسب نہیں اور آپ کی پارٹی علمی طور پر بھی اس کی اہل نہیں کہ ایسے اہم اور ذمہ دارانہ مسائل میں جسارت کر سکے۔ آپ حضرات کے لیے اعراس موالید، اسقاط، ختم، ساتواں، چالیسواں، جمعرات ایسے مفید مشاغل کیا کم ہیں۔ آپ خواہ مخواہ ایک علمی ذمہ داری کے لیے میدان میں تشریف لائے ہیں۔

۱۳ کوئیں کی پاکیزگی، ڈولوں کی مقدار اور تعداد میں جو تفاوت رکھا گیا ہے وہ بھی محض آثار ہی ہیں۔ کتاب اللہ یا سنتِ صحیحہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ایک کوئیں میں چڑیا یا چوہا یا ممولا وغیرہ گر جائیں تو آپ کے ہاں بیس ڈول نکالنے سے کوآں پاک ہوگا۔ خاموشی سے تقلیداً مان لینا تو اور بات ہے، ذرا سوچیئے، انیس ڈول نکلنے تک تو کوآں بالکل ناپاک ہوگا بیسواں ڈول ساری پلیدی لے کر باہر آئے گا اور آپ یقین کریں گے اور مطمئن ہوں گے کہ اب کوآں بالکل پاک ہے۔ لیکن اس بیسویں ڈول سے جو پلیدی کا بقیہ لے کر آرہا ہے جس قدر قطرے کوئیں میں گریں گے کوآں پھر سے پلید نہ ہوگا۔ دراصل ان تمام آثار کی بنیاد نزاہت اور طبعی کراہت پر ہے آپ نے اسے تشریعی حکم قرار دے کر پانی کے چند قطروں سے پاک اور پلید کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی، چہ عجب۔

اتنی کمزور عمارت اور بودے دلائل کے ہوتے ہوئے آپ اہل حدیث اور مسالک پر حملہ آور ہوتے ہیں حالانکہ ان کا مسلک استدلال کے لحاظ سے کافی مضبوط ہے۔ یہ مسئلہ کس قدر صاف اور معقول ہے کہ پانی کم ہو یا زیادہ، کنوئیں میں ہو یا تالاب میں، تالاب دہ در دہ ہو یا چھوٹا اس میں نجاست گرے اور اس کے بعض یا کل اوصاف یعنی رنگ بو اور مزہ کو بدل دے تو پانی پلید ہو جائے گا اور اس میں اگر مزید اتنا پانی داخل کیا جائے جس سے یہ اوصاف درست ہو جائیں یعنی رنگ بو اور مزہ درست ہو جائے۔ یا اس نجاست کی مقدار کو اتنا کم کیا جائے کہ اس کا بظاہر کوئی اثر نہ رہے تو پانی پاک ہوگا۔ اتنے صاف مسئلہ پر آپ ان اوچھے ہتھیا سے حملہ آور ہوتے ہیں ؎

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یوں برادرانہ طور پر صلح صفائی سے مساجد کی امامت کا محکمہ آپ کے سپرد کر دیا جائے۔ مردہ شوئی فاتحہ خوانی، اسقاط، چالیسواں وغیرہ کا ٹھیکہ آپ لے لیں تو یہ دوسری بات ہے مگر آپ اپنے دل کی تقدیس کے متعلق یقین دلا دیں کہ اس میں شرک و بدعت کی نجاست نہیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم لوگ ان شاء اللہ امامت آپ کے سپرد کر دیں گے لیکن آپ یقین فرمائیں کہ ان حالات میں یہ امامت پیٹ پوجا کا ذریعہ نہیں بن سکے گی۔

پانی کے مسئلہ میں میں نے مختصراً چند گزارشات کر دی ہیں۔ ومن استزاد فلدینا مزید۔

شراب کی طہارت } مولانا رضوی، مولانا نواب صدیق حسن خان صاحب پر اس لیے ناراض ہیں کہ نواب صاحب مغفور شراب کی نجاست کے قائل نہیں۔ یہ دوسری دلیل ہے جسے اہل حدیث کی اقتداء کے ناجائز ہونے کے متعلق پیش کیا گیا ہے۔ میرا ذاتی رجحان بھی اسی طرف ہے کہ شراب نجس ہے اور حنابلہ اور احناف کا مسلک

اس میں صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مسئلہ قیاسی نہیں اس کے لیے نص کی ضرورت ہے۔ نواب صاحب مرحوم کو اس پہ اصرار نہیں وہ بھی متین دلیل چاہتے ہیں جو بوقت تعارض ترجیح کا موجب بن سکے۔ فرماتے ہیں۔

وبالجملة فالواجب على المنصف ان يقوم مقام المنع ولا يتزحزح عن هذا المقام الا بحجة شرعية (الروضة ص ۱۲)

منصف مزاج آدمی کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں حجت شرعی کے سوا اپنے مؤقف سے نہ ہٹے۔

اس لیے بہتر ہوگا کہ رضوی صاحب شراب کی نجاست پہ کوئی نص لائیں جیسے کہ شراب کی حرمت پر نص موجود ہے۔ مناسب ہوگا کہ فتووں پہ زور ڈالنے سے زیادہ زور دلائل پہ دیا جائے۔ ہمارے بریلوی دوستوں میں یہ بنیادی کمزوری ہے کہ یہ حضرات ہمیشہ جذبات سے خطاب فرماتے ہیں اور فتووں پر زیادہ زور ڈالتے ہیں اور معقول آدمی کے لیے یہ دونوں حربے بے کار ہیں۔

نواب صاحب مرحوم شراب کو پاک نہیں سمجھتے ہیں بلکہ وہ آپ کے ساتھ متفق ہیں کہ شراب نجس ہے قرآن مجید میں ہے۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ شراب، جوا، بت اور قسمت آزمائی کے تیر سب پلید ہیں اور شیطانی عمل، آلات قمار اور انصاب پلید ہونے کے باوجود ان کے چھونے سے نہ جسم پلید ہوتا ہے نہ کپڑے بلکہ ان کی نجاست حکمی ہے حسی نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ انما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام مشرک نجس ہیں، اس لیے وہ (بلا اجازت) مسجد حرام میں نہ آئیں۔ قرآن مجید کا یہ حکم تمام مشرکین کے لیے عام ہے کہ وہ نجس اور پلید ہیں ہندوستان کے مشرک ہوں یا پاکستان کے، عرب کے ہوں یا عجم کے، لیکن معلوم ہے کہ ان کے چھونے سے نہ کپڑے پلید ہوتے ہیں نہ جسم۔ نواب صاحب مرحوم فرماتے ہیں۔

وهذا يدل على ان تلك النجاسة حكمية لا حسية والتعبد انما هو بالنجاسة الحكمية (ص ۱۲ الروضة)

یہ حکمی نجاست ہے حسی نہیں اور عبادت میں پرہیز حسی نجاست سے ہے۔

وفد ثقیف مسجد نبوی میں آیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد دھولے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بیت اللہ میں مشرک آتے جاتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکاوٹ نہیں فرمائی۔ کیوں کہ یہ نجاست حکمی تھی حسی نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کا پانی استعمال فرمایا۔ قرآن حکیم میں محرمات النکاح کا مفصل تذکرہ موجود ہے لیکن ان رشتوں میں کوئی بھی پلید نہیں۔ حرمت دوسری چیز ہے، نجاست دوسری چیز۔

میں نے عرض کیا ہے کہ میری وجدانی کیفیت یہ ہے کہ میں اس مسئلہ میں احناف کے مسلک کو صحیح سمجھوں لیکن نواب صاحب مرحوم اور امام شوکانی کی گرفت بھی معمولی نہیں فتفکر ولا تکن من الغافلین۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ان چیزوں کو حسی نجس ثابت کرنے کے لیے دلیل لائیے۔

سونا، چاندی، ریشم مردوں پر حرام ہیں، لیکن ان کے چھونے سے جسم پلید نہیں ہوتا نہ نماز میں خلل واقع ہوتا ہے۔ تمام زہر کچلہ، سم الفار وغیرہ حرام ہیں، نجس نہیں۔ اسی طرح مخدرات حرام ہیں پلید نہیں۔ نواب صاحب شراب کو حرام بھی سمجھتے ہیں اور پلید بھی، لیکن اس کی نجاست کو حسی نہیں سمجھتے یہ ایسا جرم نہیں جس پہ آپ حضرات خفگی فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی فرما سکتے ہیں کہ مرحوم نے ٹھیک نہیں سمجھا اور یہ بھی اس وقت جب بین دلیل مل جائے

مولانا! نواب صاحب کا یہ حال ہے کہ نہ وہ شراب کے ساتھ علاج جائز سمجھتے ہیں۔ نہ اسے سرکہ بنانا جائز سمجھتے ہیں اور نہ شراب میں گوشت پکانا ان کے ہاں درست ہے۔ لیکن حنفیہ رحمہم اللہ کے ہاں چار قسم کی شراب حرام ہے اور چار قسم کی حلال۔

والحلال منها اربعة انواع نبيذ التمر والزبيب ان طبخ ادنى طبخة يحل شربه وان اشتد وهذا اذا شرب منه بلا لهو وطرب ما لم يسكر والثانی الخليطان والثالثة نبيذ العسل والتين والبر والشعير طبخ اولا والرابع المثلث (الدر المختار ص۴۳۸ نولکشور)

چار قسم کی شراب حلال ہے۔ کھجور اور منقی کا نبیذ جب اسے تھوڑا سا پکایا جائے۔ دوسرا مخلوط نبیذ۔ تیسرا شہد اور انجیر وغیرہ کا نبیذ اور چوتھا مثلث انگور کا شیرہ جس کا دو تہائی جل چکا ہو یہ سب قسمیں حلال ہیں بشرطیکہ قوت کی نیت سے استعمال کی جائیں لہو ولعب کا ارادہ نہ ہو۔

جب حنفی مذہب میں اتنی وسعت ہے کہ نیک نیتی سے بقدر ضرورت پی بھی لی جائے تو حرج نہ ہو۔ اور وہابیوں پہ صرف طہارۃ مع الحرمت کی بنا پہ اتنا سنگین فتویٰ دینا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ فر من المطر وقر تحت المیزاب کا معاملہ ہوگا سے

اے رحمت تمام میری ہر خطا معاف
میں عفو کی امید پہ تھرا کے پی گیا

میرا مقصد ان گزارشات سے نہ الزام ہے نہ عیب چینی، مقصد یہ ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات آ سکتی ہیں جن کی وجہ سے بات بھی اہل علم کے پاس ہوتی ہیں۔ غلط ہوں یا صحیح، فریق مخالف اسے قبول کرے یا نہ کرے لیکن ان جزئیات سے جذباتی طور پر عوام کو انگیز کرنا علم کی شان نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ شراب کے استعمال میں جس قدر وسعت احناف کے مسلک میں ہے دوسرے آئمہ

کے مسلک میں نہیں۔ سننِ نسائی کے آخری ابواب پڑھیے اور سوچیے کہ اہلِ علم نے اس ام الخبائث کے استعمال میں کس قدر کمزوریاں کی ہیں جس کی پیشگوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور سب سے زیادہ محتاط مسلک اس میں اہلِ سنت والحدیث کا ہے۔ پھر صرف طہارت پر طعن بازی کیوں کی جائے۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ نواب صاحب اور امام شوکانی کی تحقیق تمام اہلِ حدیث کے نزدیک مسلّم ہو۔ آپ کے ہاں جو مقام حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اور ان کی فقہیات کو حاصل ہے ہمارے ہاں نواب صاحب اور ان کی تصانیف کو وہ مقام حاصل نہیں ہے۔ ہم نواب صاحب اور امام شوکانی سے کئی مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں اس لیے ادباً گذارش ہے کہ اسے حجاعتی سوال نہ بنایا جائے۔

شراب کے مسئلہ میں غالباً لفظ نبیذ کی وضاحت میں وقت ضائع نہیں فرمایا جائے گا۔ غلیان اور اشتداد کے بعد خمارِ عقل تو ضرور ہوگا آپ اسے نبیذ مخمر فرمائیے مجھے اسے خمر النبیذ کہنے کی اجازت دیجیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی کہ یسمونہ بغیر اسمہ (نسائی) تو درست اور حق ہے۔ الفاظ کی ہیرا پھیری کا حقیقت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ علماء نے اسے شراب ہی سے تعبیر فرمایا ہے ملاحظہ ہو۔ طبقات الحنابلہ لابی یعلی ص۱۱۳ امام خلف بن ہشام بن ثعلب ۲۲۹ھ اعدت صلوٰۃ اربعین سنۃ کنت اتناول فیہا الشراب علی مذہب الکوفیین اھ میں نے چالیس سال کی نماز کا اعادہ کیا کیونکہ میں اصحابِ کوفہ کے مسلک کے مطابق شراب پیتا رہا۔ جمہور صحابہ اور تابعین کا مسلک یہ ہے کہ ہر مست کرنے والی چیز تھوڑی ہو یا زیادہ حرام ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت اس کی مؤید ہے۔ امام محمد اور مشائخ سے ایک گروہ نے یہی مسلک پسند فرمایا ہے۔ امام شعبی نخعی اور امام ابوحنیفہؒ سے ایک دوسرا مسلک بھی منقول ہے کہ انگور اور کھجور کے سوا از گیہوں وغیرہ شراب درست ہے بشرطیکہ حدِ سکر کو نہ پہنچے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "کُلُّ مُسْکِرٍ خَمْرٌ"۔ جو مست کرے وہ خمر ہے مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ مسکر چیز کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔ اس لیے پہلا مسلک صحیح ہے۔ دوسرا مسلک اجتہادی غلطی پر مبنی ہے۔

جب احناف میں شراب کے متعلق اتنا نرم رویہ اختیار فرمایا گیا ہے تو نواب صاحب اور بے چارے اہلِ حدیث پر صرف پاک اور حرام کہنے پر کیوں خفگی فرمائی جا رہی ہے۔

قصۂ پارینہ نوکِ قلم پر آگیا ہے۔ اجازت دیجیے کہ مبحث اور نکھر جائے تاکہ جناب سنجیدگی سے غور فرما سکیں اور نواب صاحب اور اہلِ حدیث کی قرار دادِ جرم کبھی منظرِ عام پر آجائے تاکہ اربابِ دانش سوچ سکیں کہ معاملہ کہاں تک سنگین ہے کچھ حقیقت بھی ہے یا صرف "شیر آیا" تک ہی ساری داستان ختم ہو جاتی ہے۔

قاضی خاں فرماتے ہیں ص۱۱ جلد ا ذکر الناطفی عن محمد اذا صلی علی جلد کلب او ذئب قد ذبح جازت صلوته الخ امام محمد فرماتے ہیں اگر کتا یا بھیڑیا ذبح کیا جائے اس کے چمڑے پر نماز جائز ہے۔

اما اذا ذبح بالتسمیة وصلی مع لحمه او جلده قبل الدباغة یجوز۔ (منیة المصلی ص) جب کتا وغیرہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا جائے اس کے گوشت سمیت اس کے چمڑے پر نماز پڑھی جاوے رنگنے سے پہلے تو جائز ہے۔

معلوم ہے درندے حرام ہیں حرمت کے باوجود جب بسم اللہ کے ساتھ ذبح کیے جائیں تو ان کا گوشت اپنے پاس رکھ کر ان کے چمڑے پر نماز ہو جائے گی۔

مولانا! یہ بالکل وہی چیز ہے جو نواب صاحب فرما رہے ہیں۔ شراب حرام ہے لیکن پاک۔ یہاں گوشت اور چمڑہ دونوں حرام ہیں مگر ذبح سے پاک ہو گئے ہیں۔ فرمائیے آپ میں اور نواب صاحب میں کیا فرق ہے؟ نواب صاحب بے چارے صرف شراب کو پاک کہتے ہیں لیکن جناب کے ہاں غیر مسکر پی کر کتے کا گوشت جیب میں رکھ کر اور اس کے چمڑے کا مصلے (دباعت سے پہلے) پاؤں کے نیچے بچھا کر نماز پڑھنی جائز ہے اور پھر بھی کافر وہابی ہی ہیں۔ انا للہ

جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ عادت کے خلاف ہے۔ میں اجتہادی لغزشوں کی نمائش کا عادی نہیں۔ مگر آپ کا فتویٰ بے حد لغزش تھا اس لیے بادلِ نخواستہ حقیقتِ حال سے پردہ اٹھانا پڑا ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

آپ غور فرمائیں، اصولاً آپ میں اور نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں کوئی فرق نہیں۔ صرف کتے اور شراب کا فرق ہے۔ اصولی اتحاد کے بعد جزوی اختلاف کی بنا پر اس قدر تیزی اہلِ علم کے لیے مناسب نہیں۔

پھر جو کچھ نواب صاحب نے فرمایا یہ پوری جماعت اہلِ حدیث کا مسلک نہیں۔ جماعت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو شراب کو احناف اور حنابلہ کی طرح نجاست مغلظہ سمجھتے ہیں۔ صریح دلائل کے فقدان کے باوجود میرا ذاتی رجحان اسی طرف ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ آپ بوقتِ ضرورت وہابی امام سے دریافت فرمالیں کہ وہ ام الخبائث کو پاک تو نہیں سمجھتے اور اگر وہ بھی آپ کی طرح متعصب ہو تو دریافت کر لے کہ جناب نے کچھ زیادہ تو نہیں پی اور جیب مبارک میں لحم الکلب کے کچھ ٹکڑے تو نہیں ہیں اور مصلیٰ بھی ذبیحہ کے چمڑے سے نہیں بنوایا گیا۔

ہمارا مسلک آپ سے بالکل الگ ہے۔ ہم ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ حنفی ہو یا اہلِ حدیث، لیکن غیر مسلم اہلِ حدیث اور غیر مسلم حنفی کی اقتدار کے لیے تیار نہیں۔ یہ دونوں قسمیں آج کل عام ہیں۔ اہلِ حدیث اور حنفی کے لیے تو بحث کرتے ہیں لیکن عملاً بلکہ عقیدۃً وہ غیر مسلم ہوتے ہیں۔ جھوٹ بد دیانتی سب کرتے ہیں لیکن حنفیت اور وہابیت کے لیے خوب لڑتے ہیں۔ ایسے لوگ کوئی نام رکھیں ان کی نماز، اقتدار سب مشتبہ ہے اور افسوس ہے کہ غیر مسلم حنفیوں کی آج کل بہت کثرت ہے۔

پگڑی پہ مسح } سر پہ مسح کرنا فرض ہے۔ احناف اس سے چوتھائی سر مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں مسح علی الناصیۃ صراحۃً آیا ہے اور ناصیہ سے مراد ان کے ہاں ربع سر ہے۔ شوافع کا خیال ہے کہ سر کی کسی طرف سے کم از کم چند بالوں کا مسح ہو جائے۔ موالک پورے سر کا مسح ضروری سمجھتے ہیں۔ حدیث شریف میں مسح کی تین صورتیں مروی ہیں۔ پورے سر کا مسح، سر کے بعض حصے پہ اور کچھ پگڑی پہ، اور پوری پگڑی پہ، احناف کا معمول احادیث میں بصراحت موجود نہیں۔ صرف مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو مختصر ہے اور صحیح مسلم میں دونوں روایتیں موجود ہیں۔ قرآن کے اطلاق پہ صرف موالک کا عمل ہے۔ ایک توضیح احناف نے کی اور پورے سر کو چوتھائی کرایا اور شوافع نے چند بال سے اس کی تفسیر کی، یہ چیزیں تو گوارا ہیں آپ بھی حق پہ، شافعی بھی حق پہ اور موالک بھی حق پہ اور اہلِ حدیث اگر سنتِ صریح کے مطابق پگڑی پہ مسح کریں تو معتوب۔ اب حدیث سنیے۔

عن عمرو بن امیۃ الضمری قال رَأَیْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم یَمْسَحُ عَلٰی عِمَامَتِہٖ وَخُفَّیْہِ (صحیح بخاری مع کرمانی پ ۳ ص ۵۳)	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے موزوں اور پگڑی پہ مسح فرمایا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

وذھب احمد بن حنبل الی جواز الاقتصار علی العمامۃ ووافقہ علیہ جماعۃ (مسلم مع نووی ج ۱ ص ۱۳۴)	امام احمد بن حنبل صرف پگڑی پہ مسح جائز سمجھتے ہیں اور سلف سے ایک جماعت ان کے ساتھ متفق ہے۔

حدیث مسح علی العمامۃ حضرت بلالؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت سلمان اور ثوبان رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ اب آپ سوچ لیں کہ وہابیوں کے ساتھ کون کون بزرگ محروم الاقتدار تصور ہوتے ہیں ؎

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

مولانا! معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی سخت قسم کے وہابی تھے۔ بریلی اور

لاہور کے اربابِ فکر سوچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار میں بھی نماز کا بیڑہ غرق ہونے کا فتویٰ صادر فرما سکیں تو اپنے بزرگوں کی وراثت میں دارالندوہ کی چابیاں آپ حضرات کے سپرد کر دی جائیں گی اور حق دار کو حق مل جانے پر ہمیں بھی مسرت ہوگی۔

وجوبِ غسل: زن و شوی کے تعلقات میں اگر کسی فتور کی وجہ سے مادہ منویہ کے نکلنے کی نوبت نہ آئے تو جمہور کا مذہب ہے کہ غسل واجب ہے احناف کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام بخاری اور بعض دوسرے آئمہ سلف کا مذہب ہے کہ اس صورت میں غسل واجب نہیں، احتیاط اس میں ہے کہ غسل کرے (صحیح بخاری)

دونوں مسلک کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔ چونکہ تاریخ معلوم نہیں اس لیے نسخ کا دعویٰ تو صحیح نہیں جو مسلک راجح ہو اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی دوسرے اجتہادی مسائل کی طرح ہے۔ اقتدار کے جواز یا عدمِ جواز پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ صحیح بخاری، فتح الباری، نیل الاوطار، فتاویٰ ابن تیمیہؒ میں تفصیل مل سکے گی۔

پاؤں پر مسح: یہ مولانا رضوی کی آخری دلیل ہے کہ اہلِ حدیث پاؤں پر مسح جائز سمجھتے ہیں۔ فتاویٰ ابراہیمیہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ مولوی ابراہیم کون ہے اور فتاویٰ ابراہیمیہ کیا بلا ہے۔ ہم صراحتہً گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اہلِ حدیث کا یہ مسلک نہیں اور غالباً شیعہ کے سوا آئمہ سنت سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں۔

آخری گزارش: ہم رضوان اور اس کے ادارہ کے محترم ارکان کو نظر انداز کر رہے تھے۔ خیال نہ تھا کہ ان بزرگوں کو خواہ مخواہ تکلیف دی جائے۔ یہ پہلی دفعہ جوابی گزارشات کی گئی ہیں۔ ممکن ہے آئندہ بھی اسی غلطی کا ارتکاب ہو اس لیے مولانا رضوی اور ان کے رفقاء ایک بات سمجھ لیں کہ اہلِ حدیث علماء اور بزرگوں کے فقہی اقوال ہمارے ہاں اساسِ مذہب نہیں۔ نہ ہی ہم انہیں آئمہ اجتہاد کی طرح امام مانتے ہیں نہ ان کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہ چیزیں بطورِ الزام نہ لکھی جائیں۔ واجب التعمیل ہمارے لیے صرف کتاب و سنت اور آثارِ سلف کے سوا کچھ نہیں۔ آثارِ سلف میں اجماعی مسائل کی پابندی ہوگی۔ باقی مسائل میں جہاں سلف مختلف ہوں گے ہم کسی کے پابند نہیں۔ مناسب ہوگا کہ لکھتے وقت یہ اصل پیشِ نظر رہے اس سے بحث میں طول نہیں ہوگا اور شاید ہم ایک دوسرے کے کچھ قریب بھی ہو سکیں گے۔

الاعتصام: شمارہ ۲۷ اپریل ۵۱ء
تا شمارہ یکم جون ۵۱ء

فتاوے

حدیث ثلاث کذبات کی تحقیق

(سوال)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین :

کیا بخاری شریف کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے ؟ نیز بخاری شریف کی وہ حدیث جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹوں کا تذکرہ ہے صحیح ہے یا ضعیف ؟ یہ حدیث قرآن مجید کی آیت اِنَّهٗ کَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا سے متعارض ہے ۔ اگر حدیث صحیح ہے تو یہ تعارض کیسے دور کیا جا سکتا ہے ۔ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن جلد سوم میں اسی حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ ایک پیغمبر کو جھوٹا ثابت کرنے کی بجائے بخاری کے راویوں کو جھوٹا کہنا آسان ہے ۔ بینوا و توجروا

(سائل)

الجواب و باللہ التوفیق

حدیث لم یکذب ابراہیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصفِ صدیقیت کی مؤید ہے ۔ اصل مغالطہ اس سے ہوا کہ عرفِ عام میں جھوٹ اور کذب کو ہم معنی سمجھ لیا گیا اسی طرح صدق اور سچ کو مرادف سمجھ لیا گیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان میں ان دونوں لفظوں کے معنی ہماری زبان سے وسیع ہیں ۔ کذب کے معنی ترغیب دلانا بھی مستعمل ہے ۔ کذبته نفسه کے معنی ہیں اس کے دل نے اسے ترغیب دلائی ۔

کذب وجوب کے معنی میں بھی آتا ہے ۔ قال الجوھری کذب فقد یکون بمعنی وجب وقال الفراء کذب علیك ای وجب (نہایہ ابن اثیر ص۱۲ ج۴ م) جوہری اور فراء کہتے ہیں کَذِبَ کا معنی وَجَبَ ہے ۔

کَذِبَ لزِمَ کے معنی میں بھی آیا ہے ۔ کذب علیکم الحج والعمرۃ تم پر حج اور عمرہ لازم ہو گیا ہے ۔

غلطی خطاء کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے ۔ حدیث میں کذب ابو محمد ۔ ابو محمد نے غلطی کی ۔ ابو محمد صحابی ہیں ان کا نام مسعود بن زید رضی اللہ عنہ ہے ۔ ذوالرمہ شاعر نے کہا ما فی سمعه کذب اس کے سماع میں غلطی نہیں ۔ اسی طرح یہ لفظ اور بھی کئی معنی میں مستعمل ہوا ہے ۔ ابن اثیر فرماتے ہیں کما ان الکذب ضد الصدق وان افترقا من حیث النیة والقصد لان الکاذب یعلم ان ما

یقولہ کذب والمخطی لایعلم (نہایہ ابن اثیر ص۱۳ ج۴)

اجتہادی غلطی پر بھی کذب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں نوف بکالی کے متعلق ابن عباسؓ نے فرمایا کذب عدو اللہ نوف نے غلطی کی۔ نوف تابعی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر کذب جھوٹ نہیں جس طرح ہر سچ صدق نہیں۔

اسی طرح راغب نے غریب القرآن میں فرمایا ہے۔ باقی لغت کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

اس تفصیل کے بعد ظاہر ہے کہ جس کذب سے قرآن عزیز نے منع فرمایا ہے اس میں دو شرطیں ہیں۔ اول یہ کہ وہ واقعہ کے خلاف ہو۔ دوسرا یہ کہ متکلم کا ارادہ ہو کہ وہ مخاطب کو حقیقت سے آگاہ نہ ہونے دے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی کم ہو تو کذب کا اطلاق صحیح اور حقیقت پر مبنی نہ ہوگا۔

قرآن عزیز نے منافقین کے تذکرہ میں فرمایا۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (منافقون)

جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

یہاں منافقین کی صحیح بات کی بھی تصدیق کے باوجود انہیں کاذب قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کے ضمیر کی آواز نہیں بلکہ ضمیر کی آواز اس کے خلاف ہے۔ صدق اور کذب میں جس طرح واقعہ یا محکی عنہ کو دخل ہے اسی طرح ارادے کو بھی دخل ہے۔ صدق اور کذب کے معنی سمجھ لینے کے بعد ایک تیسری چیز بھی ذہن میں آجانی چاہیے۔ جب متکلم خبر، واقعہ اور مخبر عنہ کے مطابق دے لیکن اس واقع اور حقیقت کو مخاطب سے مخفی رکھنا چاہے تو اسے تعریض یا توریہ کہتے ہیں یہ حقیقت میں سچ ہوتا ہے لیکن ایک لحاظ سے اسے جھوٹ کہا جا سکتا ہے۔ راغبؒ فرماتے ہیں:۔

والتعریض کلام لہ وجہان من صدق وکذب او ظاهر وباطن قال فیما عرضتم به من خطبة النساء (ص۱۰۲)

تعریض ایسی گفتگو ہوتی ہے جس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ وہ من وجہ صدق ہے اور من وجہ کذب۔ جیسے فیما عرضتم بہ من خطبۃ النساء سے واضح ہے۔

ثلاث کذبات

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان تین واقعات پر غور فرمائیں۔ یہ صدق

ہیں یا کذب یا تعریض۔ اور یہ احادیث قرآن سے متعارض ہیں یا قرآن کے موافق۔ ان تین واقعات میں سے دو تو قرآنِ عزیز میں موجود ہیں اور ایک حدیث میں۔ مودودی صاحب اور مولانا آزاد ایسے حضرات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خیراندیش پہلے قرآن سے قرآن کی تطبیق دیں اور تعارض رفع فرمائیں تیسرے واقعہ کی تطبیق ہم گزارش کر دیں گے۔ ان شاء اللہ۔ نہ بخاری کی صحت پہ آنچ آئے گی نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت پہ دھبہ آئے گا۔ نہ رواۃ حدیث اور ائمہ سنت کو جھوٹا کہنے کی مجبوراً کوشش کی ضرورت محسوس ہوگی۔ آپ حضرات کیا تطبیق دیتے ہیں اور قرآن کو تعارض سے کس طرح بچاتے ہیں اس کے لیے ہم گوش برآواز ہیں۔ ہماری گزارش سُن لیں۔

بت شکنی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم کو بت پوجتے دیکھا تو فرمایا: مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ ”ان ٹھاکروں کی مورتیوں کو تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے“ پھر پوری صراحت سے حلفی اعلان فرمایا: تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ”تمہاری غیرحاضری میں یقیناً تمہارے ان ٹھاکروں کا تیا پانچہ کر کے رہوں گا“ غور فرمایئے اس اعلان اور حلفی بیان کے بعد جھوٹ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قوم اپنے مشاغل کے لیے چلی گئی ان کی غیرموجودگی میں پورے اطمینان سے بڑے ٹھاکر کے سوا باقی ٹھاکروں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ واپسی پر جب بت خانہ ویران پایا تو کہرام مچ گیا۔ بڑے حزن و ملال سے قوم کے چودھریوں نے کہا: مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ”کس بڑے ظالم نے ہمارے ٹھاکروں کا یہ برا حال کر دیا ہے“، بات ڈھکی چھپی نہ تھی۔ حلفی اعلان ان کے کانوں میں تھا۔ فوراً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملزم قرار دیا گیا۔ سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِيْمُ ”ایک ابراہیم نامی نوجوان کو ہم نے سنا تھا وہ ان کو برا بھلا کہتا تھا“ اسی وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلانے کا فیصلہ ہوا: فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ”اسے کھلی عدالت میں پیش کر کے اس کے خلاف شہادت قائم کرو۔“ اس قدر کھلے اور پیش پا افتادہ واقعات میں نہ جھوٹ کی گنجائش ہے نہ انکار کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کی بے وقوفی کو نمایاں کرنے کے لیے جواب میں تعریض کی صورت اختیار کی کھلا اقرار نہیں کیا۔ اس لیے کہ واقعہ تو معلوم ہی تھا۔ فرمایا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ۔

امام رازیؒ نے ”فَعَلَهٗ“ پر وقف کر کے تقدیر عبارت اس طرح فرمائی ہے: بَلْ فَعَلَهٗ مَنْ فَعَلَهٗ ”جس نے کیا کیا“ تم انہی سے دریافت کرو۔ بہتر ہے یہی بتا دیں۔ زبان کے لحاظ سے

حقیقت کے اظہار میں ایک گونہ اغماض ہے۔ وقتی مقاصد اور تبلیغی لحاظ سے یہی مناسب ہے کہ ان کا جدامجد بھی بڑا ٹھاکر ہی اس ہنگامے کا موجب ہے اس لیے ان مقتولوں کے نزعی بیان لو۔ اور اس بڑے ٹھاکر سے پوچھو جس کے سامنے یہ ہنگامہ ہوا۔ سارا زور فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ پر ہے۔ جس کے نتیجہ میں مجرمانہ ندامت کے ساتھ ان لوگوں نے سر عدالت اقرار کیا۔ فَنُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ "سر نیچا کیے ہوئے ندامت سے اقرار کیا یہ (بے چارے) بول تو نہیں سکتے۔" اصل مقصد یہ تھا کہ ان کی زبان سے ان کے دھرم کی کمزوری ظاہر ہو جائے ورنہ دونوں فریق جانتے تھے کہ جسے بولنے کی ہمت نہیں ساتھیوں کو بچانے کی قدرت نہیں، اسے توڑنے کی قدرت کہاں سے ہو گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس حکیمانہ تعریضی اقرار کے بعد عدالتِ وقت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آخری سزا سنا دی: حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ "(بات تو صاف ظاہر ہے) پھر بھی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اس نوجوان کو جلا ڈالو۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی علالت

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ وہ لوگ کسی تہوار یا کسی اجتماعی کام کے لیے جانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے ہمراہ چلیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے اپنے حلفی بیان کے مطابق بتوں کو توڑنے کا پروگرام موجود تھا ستاروں پر نگاہ ڈال کر فرمایا: اِنِّیْ سَقِیْمٌ "میری طبیعت خراب ہے"، بیمار یقیناً تھے لیکن اس قدر نہیں کہ تھوڑی دور تک بھی چل نہ سکیں۔ قوم نے اس تعریض سے یہی سمجھا کہ وہ چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ بیمار ان کے جانے کے بعد پورے بت خانہ کو تلپٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ سقیم کے اظہار میں حضرت ؑ نے اجمال سے کام لیا نہ قوم نے تفصیل پوچھی نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی ضرورت سمجھی۔ یہ ابہام اور تعریض تھی جو بالکل سچائی اور حقیقت پر مبنی تھی مگر قوم نے اسے واقعی اہم بیماری سمجھا۔ انہیں حق ہے کہ اس من وجہ صداقت کو کذب سے تعبیر کریں۔ اس لیے تعریض اور توریہ کو من وجہ کذب سمجھا جا سکتا ہے۔ سائل کے سوال کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان واقعات میں خود قرآن عزیز میں تعارض ہے۔ ایک ایسا مریض جو قوم کے نظروں سے ذرا اوجھل ہوتے ہی پورے بت خانہ کا صفایا کر سکتا ہے۔ سینکڑوں مصنوعی خداؤں کو چند گھڑیوں میں پیوندِ خاک کر سکتا ہے اس کی بیماری کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ یہ تعریض ہی کے پیمانہ سے ناپی جا سکتی ہے جس کا اندازہ دوست اور دشمن اپنے نقطۂ نظر سے لگا سکیں۔

بیوی یا بہن

صحیح بخاری میں یہ حدیث قریباً پانچ مقامات پر مذکور ہے۔ کہیں پورا متن، کہیں

مختصر کہیں تعلیقاً، کہیں مرفوعاً باسند۔ کتاب الانبیاء میں یہ مفصلاً موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: لَمْ يَكْذِبْ إِبْرَاهِيمُ إِلَّا ثَلَاثَ كَذَبَاتٍ ثِنْتَيْنِ مِنْهُنَّ فِي ذَاتِ اللّٰهِ قَوْلُهُ إِنِّي سَقِيمٌ وَقَوْلُهُ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عمر میں تین دفعہ بظاہر غلط بیانی کی۔ دو مقام پر تو ذاتِ حق کی عظمت کا تحفظ مقصود ہے۔ تیسرا مقام بھی گو حدود اللہ کی حفاظت ہی سے متعلق ہے لیکن اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی ذات کا بھی دخل ہے۔ کیونکہ یہ بیوی کی عصمت کا معاملہ ہے چنانچہ بعض روایات میں كُلُّهُنَّ فِي اللّٰهِ (فتح الباری ص۲۳۲) مرقوم ہے۔ یعنی یہ تینوں مقام ذاتِ حق کی عظمت اور برتری قائم کرنے کے سلسلہ میں تھے۔ اسی متن میں تیسرے واقعہ کی تفصیل جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہے۔ ایک ظالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت سارہؑ کے متعلق دریافت کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا یہ میری بہن ہے۔

فَأَتَى سَارَةَ فَقَالَ يَا سَارَةُ لَيْسَ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ مُؤْمِنٌ غَيْرِي وَغَيْرُكِ وَإِنَّ هٰذَا سَأَلَنِي فَأَخْبَرْتُهُ أَنَّكِ أُخْتِي فَلَا تُكَذِّبِينِي الخ (صحیح بخاری ص۴۷۴ ج۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ میں نے ظالم کے پاس تمہیں اپنی بہن کہا ہے۔ تم میری تکذیب نہ کرنا کیونکہ دین کے لحاظ سے تم میری بہن ہو اور اس سرزمین میں تمہارے سوا کسی سے میرا دینی رشتہ نہیں ہے۔

اس تعریض کی حقیقت حضرت سارہؑ نے خود ظاہر فرما دی کہ اس سے دینی اخوت مراد ہے۔ گو ظالم اس سے بظاہر نسبی اخوت سمجھے گا۔ اس تعریض سے یہی مغالطہ مقصود ہے تاکہ عصمت بھی محفوظ رہے اور شر بھی نہ پہنچ سکے۔

ایسے حالات میں عصمت کی حفاظت، حدود اللہ کے احترام اور مشرکانہ دربار وں کی بربادی کے لیے اگر واضح جھوٹ بھی بولا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: إِذَا ابْتُلِيَ أَحَدُكُمْ بِبَلِيَّتَيْنِ فَلْيَخْتَرْ أَهْوَنَهُمَا۔ (حدیث) جب تم میں سے کسی کے سامنے دو مصیبتیں آجائیں تو ہلکی تکلیف کو پسند کر لے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعریض کی راہ اختیار فرمائی جو حقیقت صحیح ہے اور اس کی سچائی معلوم۔ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا:

والا فالكذب المحض فى تلك المقامات يجوز وقد يجب لتحمل اخف الضررين دفعا لاعظمهما اھ (فتح الباری ص۲۳۲ ج۶ طبع ہند)

اسی مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہؑ کے سامنے حقیقت کھول دی۔ ظالم

کو مغالطہ میں رکھا۔ تعریض کا یہی مطلب ہے۔ ان طویل معروضات سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ قطعاً نہیں بولا البتہ ایسی گفتگو ضرور فرمائی جس سے مخالف دین دشمنوں کو دھوکا لگ سکے اور یہ کچھ جرم نہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ۔ رواہ مسلم عن جابر و ابی ہریرۃ صہ۸۳ ج ۲۔ لڑائی میں دھوکا درست ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ کے لیے سفر فرماتے تو توریہ کرتے یعنی اصل مقام کا نام نہ لیتے بلکہ تذکرہ تعریض اور توریہ کے طور پر فرماتے: مَا یسافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِلّا وَرّٰی۔ اَوْ کَمَا قَالَ

تعبیر کے لیے کذب کیوں؟ اس وضاحت کے بعد کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کذب کا ظہور نہیں ہوا اسے کذب سے تعبیر کیوں کیا گیا؟ یہ تذکرہ حدیث شریف میں دو مقامات پر آیا ہے۔ شفاعت کی حدیث میں جب لوگ قیامت کے دن شفاعت کے لیے انبیاء علیہم السلام کے پاس پھرتے پھراتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام معذرت کے طور پر فرمائیں گے: انی قد کذبت ثلاث کذبات فذکر من الترمذی عن ابی ھریرۃ و قال حسن صحیح صہ۲۹۷ ج۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے تین کذبات کا ذکر فرما کر شفاعت سے انکار فرما دیں گے۔

دوسرے مقام پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کذبات کا ذکر فرمایا۔ یہ حدیث بخاری نے صحیح میں متعدد مقامات پر ذکر کی ہے: لَمْ یَکْذِبْ اِبْرَاھِیْمُ اِلَّا ثَلَاثَ کَذِبَاتٍ (کتاب الانبیاء صحیح بخاری)

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ یہ تعریض ہے جسے من وجہ کذب کہا جا سکتا ہے تو متکلم کو اختیار ہے جس عنوان سے چاہے تعبیر کرے۔

نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ شفاعت سے گریز فرما رہے ہیں اس لیے انہیں وہی عنوان اختیار کرنا چاہیے جو اس مقصد کے لیے مفید ہو۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس قسم کی تعریض بھی عمر میں تین ہی دفعہ فرمائی۔ اس تعریض کذب کے مرافع زیادہ نہیں۔ یہ بھی چونکہ من وجہ صدق ہے۔ حقیقت میں مقام توحید کی طرف ایک مجاہدانہ قدم ہے اور عصمت کے لیے ذریعہ، اس لیے اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا کی تائید ہے۔ تعارض ہے ہی نہیں۔ حضرت نے صراحتاً فرمایا تو بھی سچ تھا اور

تعریضاً فرمایا تو بھی سچ تھا۔ صدیقاً کا معنیٰ یہی ہے کہ لم یکذب قط او لم یکذب الا قلیلا۔ لسان العرب ج ۱، راغب۔ محیط المحیط۔ قاموس۔ اقرب الموارد وغیر ذالک من اسفاد اللغۃ۔

اب اس کی تائید اور وضاحت میں حافظ ابن قیمؒ حسن اور قبیح عقلی اور شرعی کی بحث میں اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تعریضات کو کذب سے کیوں تعبیر فرمایا۔ کہتے ہیں:

فان قیل کیف سماها ابراهیم کذبات وهی تعریض صحیح قیل لا یلزمنا جواب هذا السوال اذا الغرض ابطال استدلالکم وقد حصل تبرع منا وتکمیل للفائدۃ و لم اجد فی هذا المقام للناس جوابا شافیا یسکن القلب الیه وهذا السوال لا یختص به طائفۃ معینۃ بل هو وارد علیکم بعینه وقد فتح الله الکریم بالجواب عنه۔

اگر یہ کہا جائے جب یہ تعریض تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے کذب کیوں کہا۔ ہم کہتے ہیں اس کا جواب ہمارے ذمہ نہیں۔ ہمارا ذمہ صرف اس قدر تھا کہ تمہارے استدلال کا ابطال ہو جائے۔ وہ ہو چکا۔ اب جواب تبرعاً اور تکمیل کے لیے پیشِ خدمت ہے۔ یہ مقام مشکل ہے۔ لوگوں نے اس مقام پر جو کچھ کہا اس سے تسکین نہیں ہوتی۔ اور یہ سوال کسی خاص گروہ سے نہیں بلکہ ہمارے مخالفین پر بھی وارد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جو انکشاف فرمایا ہے، وہ حاضر ہے۔

فنقول الکلام له نسبتان، نسبۃ الی السامع و افهام المتکلم ایاه مضمونه فاذا اخبر المتکلم بخبر مطابق للواقع وقصد افهام المخاطب فهو صدق من الجهتین وان قصد خلاف الواقع وقصد مع ذالک افهام المخاطب خلاف ما قصد بل معنی ثالثا لا هو الواقع ولا هو المراد فهو کذب من الجهتین بالنسبتین معا وان قصد معنی مطابقا صحیحا وقصد مع ذالک التعمیۃ علی المخاطب و افهامه

ہر کلام کی دو نسبتیں ہوتی ہیں ایک متکلم کے قصد اور ارادہ سے متعلق ہے اور ایک سامع اور متکلم کو اسے سمجھانے سے۔ جب متکلم ایسی خبر دے جو واقع کے مطابق ہو اور مخاطب کو وہ یہ واقع سمجھانا چاہے یہ دونوں لحاظ سے صدق ہوگا اور اگر خلافِ واقع خبر دے اور مخاطب کو خلافِ واقعہ کچھ تیسرا معنی بتانا چاہے جو فی الحقیقت واقعہ نہیں تو یہ دونوں لحاظ سے جھوٹ ہے۔ اگر متکلم صحیح بات حسب واقع بیان کرے لیکن مخاطب کو اس سے ناآشنا رکھنا چاہیے تاکہ وہ متکلم کے مقصد کو نہ سمجھ سکے تو وہ

ومن هذا الباب التورية والمعاريض وبهذا اطلق عليها ابراهيم الخليل عليه السلام الكذب مع انه الصادق فی خبره ولم يخبر الا صدقا فتامل هذا الموضع الذی اشکل علی الناس وقد ظهر بهذا ان الکذب لا یکون قط الا قبیحا وان الذی یحسن ویجب انما هو التوریة وهو صدق و قد یطلق علیه الکذب بالنسبة الی الافهام لا الی العنایة (مفتاح السعادة ص۳۹ ج ۲)

متکلم کے قصد کے لحاظ سے صدق ہے اور اس کے افہام کے لحاظ سے کذب ہے اسے تعریض اور توریہ کہتے ہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے کذب سے تعبیر فرمایا۔ حالانکہ بات صحیح ہے۔ اور واقعہ کے مطابق ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کذب بہر حال قبیح ہے۔ اس کی مستحسن صورت تعریض اور توریہ ہے۔ جو حقیقت کے لحاظ سے صدق ہے گو افہام کے لحاظ سے اسے کذب کہا جا سکتا ہے۔

شیخ الاسلامؒ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں فرماتے ہیں۔

والخبر تارة يكون مطابقا لمخبره كالصدق المعلوم انه صدق وتارة لا يكون مطابقا لمخبره كالكذب المعلوم انه كذب وقد تكون المطابقة فی عناية المتكلم و قد يكون فی افهام المخاطب واذا كان اللفظ مطابقا لما عناه المتكلم ولم يطابق افهام المخاطب فهذا ايضا قد يسمی كذبا وقد لا يسمی ومنه المعاريض ولكن يباح للحاجة اهـ ملخصا ص۲۸۸ ج ۲۔

شیخ الاسلامؒ نے کسی قدر اختصار سے وہی فرمایا جس کی تفصیل مفتاح السعادۃ کے حوالہ میں بیان ہو چکی ہے۔

"وفی المعاریض مندوحة عن الکذب" تعریضات جھوٹ سے بچنے کا ذریعہ ہیں۔
زندگی کی مشکلات پر غور کر لیا جائے تو ہر انسان پر ایسے مواقع آتے ہیں جن میں صاف بات کی بجائے تعریض ہی پر اکتفاء کرنا پڑتا ہے۔ دنیائے صداقت کو قائم رکھنے کے لیے اور جھوٹ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ تعریضات کی راہ کھلی رہے۔ جیسے سائل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصف صدیقیت سے متعارض سمجھ کر صدیقیت کی راہ میں ضیق پیدا کر دی ہے جس قانون میں لچک نہ ہو وہ یقیناً ٹوٹ کر رہتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ سے کسی نے پوچھا آپ کے رفیق کون

ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: رجل یھدینی السبیل۔ یہ بزرگ میری راہنمائی فرماتے ہیں۔ کس قدر تعریض ہے۔ جو فرمایا وہ بالکل صحیح تھا مگر خطرات کا بھی سدِ باب ہوگیا۔

تعریضات ہر زبان کے ادبیاتِ عالیہ میں موجود ہیں جس زبان میں تعریضیات نہیں وہ زبان نامکمل ہے اور لطافت سے خالی۔

مولانا مودودی | مجھے مولانا مودودی سے تعجب نہیں، وہ جب بھی علم کی ان متعارف راہوں سے گزرے انہوں نے ٹھوکر کھائی۔ منبہ کا مسئلہ، مسلکِ اعتدال، حیاتِ مسیحؑ، دجال وغیرہ میں ان کی جدت نوازیاں کامیاب ثابت نہیں ہوئیں۔ ان کے رہوارِ قلم کی جولانیوں کا میدان دوسرا ہے۔

تعجب مولانا آزاد اور امام رازی سے ہے۔ یہ جواب کہ راوی کو جھوٹا کہنا نبیؐ کو جھوٹا کہنے سے بہتر ہے۔" بے حد سطحی ہے۔ نبی کو جھوٹا کہنا تو کفر ہے۔ بخاری کو صحیح ماننے والے نبی کو جھوٹا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ صحیح بخاری کا تمام تر انحصار نبوت کی صداقت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی صداقت پر ہے۔ مولانا مودودی کے راہوار کی جولانیوں کا میدان بالکل دوسرا ہے۔ جب بھی وہ اپنا میدان چھوڑ کر تفسیر اور فقہ الحدیث کے مرغزاروں کا رُخ فرماتے ہیں ان کا قلم ٹھوکریں کھانا شروع کر دیتا ہے۔ مولانا سے گزارش ہے وہ ان راہوں سے اگر کترا کر گزر جائیں تو نہ ان کے مقام کی رفعتوں میں فرق آئے اور نہ ان کے ادب و احترام کو نئے پیمانوں سے ناپنا پڑے۔

رہے مولانا آزادؔ تو کیا اس صراحت کی ضرورت ہے کہ کسی شخصیت کے محاسن کی تحسین کی جا سکتی ہے لیکن مساوی اور غلطیوں کی تقلید کبھی قابلِ رشک نہیں ہو سکتی۔

استدلال کی سطحیت | حدیث اور اصولِ حدیث بحمداللہ ایک زندہ اور متحرک فن ہے منکرین حدیث پون صدی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ بلکہ علمی حلقوں میں مضحکہ بن کر رہ گئے ہیں۔ حدیث پر اعتراض کرتے میں تنقید کے اصول نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ محدثین مبہم جرح کو قبول نہیں فرماتے یعنی کسی راوی کو مجمل طور پر ضعیف کہہ دینا کافی نہیں بلکہ ضعف کا تذکرہ صراحۃً اور تفصیلاً ہونا چاہیے۔ آپ حضرات اپنے کردار پر غور فرمائیں۔ آپ نہ راوی کا نام لیتے ہیں نہ جرح کی تفصیل فرماتے ہیں۔ یہ فن کے لحاظ سے جرح کی کون سی قسم ہے نہ راوی کا پتہ نہ جرح کا علم۔ جیتی جاگتی حدیث موضوعات کے مردہ خانہ میں بھیج کر آپ مطمئن ہوگئے کہ اب کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہزار احترام کے باوجود یہ جہالت اور جسارت ناقابلِ برداشت ہے۔ حدیث کو جھوٹا کہنا اتنا آسان نہیں جتنا جناب نے سمجھا ہے۔

امام بخاریؒ نے اسے قریباً چھ مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ آپ کے اس مبہم نشانے کا ہدف ہر راوی

ہو سکے گا جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچے گی۔ بات ایک حدیث کی نہیں اس کا اثر ان تمام احادیث پر پڑے گا جو مختلف ابواب علم میں ان آئمہ سے مروی ہیں۔ آپ بھی اپنے جرم کی نوعیت پر غور فرمائیں آپ نے کون سا مناظرانہ کمال ظاہر فرمایا۔ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۔ ے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

سائل کو غور فرمانا چاہیے۔ کذب کے معنی متعین ہو جانے کے بعد یہ حدیث انه کان صدیقا نبیا کی مؤید ہے یا متعارض ؟

(انتہٰی)

الاعتصام : ۲۰ / اکتوبر ۱۹۶۷ء

حُبِّ اہلِ بیت

اہل بیت سے محبت اہلِ سنت کے نزدیک ضروری ہے۔ اس میں نہ کسی پر احسان ہے نہ خوشامد، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت جزوِ ایمان ہے اور اہلِ بیت سے محبت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک حصّہ ہے، اہل بیت ہمارے ہاں حضراتِ شیعہ کی طرح کوئی مخصوص اجارہ نہیں، بلکہ تمام بنو ہاشم کو شامل ہے۔ آل عباس رض، آلِ علی رض، آلِ جعفر رض، آلِ عقیل رض، آلِ حارث، ازواجِ مطہرات رض، اسامہ بن زید رض وغیرہ سب اہلِ بیت ہیں۔

آیتِ تطہیر میں بیویوں کے بعد، حضرت علی رض، حسن رض، حسین رض، فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے شامل ہوئے۔ اِن کے مقام کو سمجھنا، احترام کرنا، ان کی بدگوئی سے بچنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یہ محبت کسی کا اجارہ نہیں اور نہ ہی اس کے عوض ہم شیعہ حضرات سے صلح کی بھیک مانگنا چاہتے ہیں۔ شیعہ صلح کریں یا نہ کریں اور اس صلح پسندی کا کوئی نتیجہ مرتب ہو یا نہ ہو، بہرحال اہلِ بیت سے محبت ضروری ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کے دن خطبہ دیا اور فرمایا : یاایها الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم لن تضلوا کتاب اللّٰه وعترتی اہل بیتی (ترمذی)، میں تم میں وہ ایسی چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ جب تک تم انہیں تھامے رہو گے تم

بھولو گے نہیں۔ وہ دو چیزیں اللہ کی کتاب اور میری اولاد اہل بیت ہیں۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض وعترتی اھل بیتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض۔ انتہی ملخصا (ترمذی)

اللہ کی کتاب آسمان سے ایک رسی لٹکائی گئی ہے اور میری اولاد اور اہل بیت یہ کتاب اللہ سے تا قیامت الگ نہیں ہوں گے۔

کتاب اللہ کے ساتھ دائمی التزام کتنی بڑی فضیلت ہے۔

اس حدیث میں اہل بیت کی منقبت ہی نہیں بلکہ سادات کا ایک امتیازی نشان بھی بتا دیا گیا ہے۔ نسب میں غلطی ہو سکتی ہے، لیکن یہ نشان واضح ہے کہ سید وہی ہو سکتا ہے جو کتاب اللہ کا عملاً پابند ہو۔ ایسے سادات سے بغض یقیناً ایمان اور دیانت سے بغض ہوگا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے فرمایا کہ تم سوموار کے دن بچوں سمیت میرے پاس آنا میں تمہارے لیے بہترین دعا کروں گا۔ چنانچہ ہم سب تعمیل ارشاد میں حاضر ہوئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کساء پہنائی اور برکت و مغفرت کے لیے دعا فرمائی (ترمذی)

کیا اچھا ہو کہ اہل عبا کے ساتھ اصحاب کسا، کو بھی شامل فرما لیا جائے تاکہ مصالحت کی راہ زیادہ واضح ہو جائے۔

عن ابی حبۃ البدری قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم حنین لا ینظر فی ناحیۃ الا رأی ابا سفیان بن الحارث یقاتل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ابا سفیان خیر اھلی۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط واسنادہ حسن (مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۷۴)

ابو حبہ بدری فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حنین کے دن جس طرف دیکھتے، ابو سفیان کو لڑتے دیکھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ابو سفیان رضی اللہ عنہ ہمارے اہل سے بہترین آدمی ہے۔

ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی اعمال کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں حنین میں ان کی جاں نثاری ان کی سچی توبہ کی دلیل ہے اور اسی جاں نثاری کی بدولت فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے "خیر اھلی" کا خطاب عطا فرمایا۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی اہلبیت سے ان کے خاندان پر جو اثر پڑے گا، اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ لن یتفرقا حتی یردا علی الحوض کا معیار سب جگہ صحیح ہوگا۔

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ، حمزہ رضی اللہ عنہ، جعفر رضی اللہ عنہ سارے ہی بزرگ ہیں جو آں حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل ہیں۔ میں نے اہل کے معنی میں عموم کو عمداً ذکر نہیں کیا اور اس سے اتباع مراد نہیں لیے کیونکہ مصلحت اور سمجھوتے میں یہ انتہا پسندانہ خیالات مقبول نہ ہوں گے، اعمال کی بہتری کی راہ سب کے لیے کھلی ہوئی ہے۔

اہل بیت کے مناقب اور مفاخر میں احادیث نبویہ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ میں نے نمونہ کے طور پر چند اشارات کیے ہیں، مولانا سے بہتر اس ذخیرہ کو کون جانتا ہے، اہل سنت اس محبت پر عقیدۃً مجبور ہیں، یہ شیعہ حضرات پر احسان نہیں اپنا فرض ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل ابن ابی ذئب رحمہم اللہ وغیرہ بزرگوں کے ارشادات ہم تک نہ پہنچتے تو کبھی ہم اہل بیت سے محبت کرتے اس لیے حب اہل بیت کی رشوت دے کر حضرات شیعہ سے مصالحت کی خواہش کرنا قطعی غلط ہے۔ اور یہ سودا قطعی غیر مفید ہے۔ فرض کیجیے حضرت مولانا میر سیالکوٹی اور سید امداد حسین صاحب کسی اچھے نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں جیسے کہ امید ہے اور جس کا اظہار مدیر درِنجف "معاذ اللہ" کے فقرہ سے فرما چکے ہیں۔ ہم پھر بھی اہل بیت سے محبت کریں گے۔

البتہ رفض و تشیع سے مصالحت، یہ دوسرا مسئلہ ہے۔ اختلاف محبت میں نہیں، محبت کی کیفیت میں ہے، شیعہ کا طریق محبت اہل بیت نے کبھی پسند نہیں کیا بلکہ تعزیہ کا یہ طریق کہ بزرگان اہل بیت کی نارسائیوں کا تذکرہ سربازار ہو اہل سنت نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ لیس منا من ضرب الخدود و شق الجیوب و دعا بدعوی الجاھلیۃ۔

بالکل یہی اختلاف مسیحیت اور اسلام میں ہے۔ اہل اسلام نے کبھی حضرت مسیح کی توہین نہیں کی لیکن مسیحی حضرات مسیح کی تعظیم کے لیے جو طریق اختیار کرتے ہیں، اسلام اسے پسند نہیں کرتا۔ محبت کے اظہار اور اس کی کیفیت میں اختلاف ہے اس میں محبت کی نفی نہیں۔

ہمارے بریلوی بزرگ اہل اللہ کی محبت کے مدعی ہیں۔ ہم بھی ان بزرگوں سے محبت کرتے ہیں لیکن محبت کے جوش میں نہ ہم بدعت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ہم بزرگوں اور ان کی قبور کو سجدہ کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک نصاریٰ اور حضرات شیعہ اور بریلوی حضرات کا طریق محبت بغض کے مرادف ہے اس میں ان بزرگوں کی توہین ہے۔ اس لیے اہل حق نے اس طریق محبت کو کبھی پسند نہیں ورنہ اسے محبت کہنا ہی غلط ہے۔ عیسائیوں سے رفع نزاع کے لیے ہم مسیح علیہ السلام کی محبت کا کبھی واسطہ نہیں دیتے اور نہ ہی یہود کا تعاون حاصل کرنے کے لیے حضرت موسیٰ اور عزیر علیہما السلام کی محبت کا واسطہ

دینا چاہتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے لیے ایک معیار ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس لیے احباب بریلی سے تعلقات کی استواری کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ ہم انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا واسطہ دیں، جب معلوم ہے کہ یہ طریق محبت ہی غلط ہے۔

محمد بن عبد اللہ بن حسن اور حضرت امام ابو حنیفہ خلیفہ منصور عباسی کے دور حکومت میں تھے، آئمہ اسلام اس طریق حکومت سے تنگ آچکے تھے۔ اسلام کا شورائی نظام قریباً آمریت مطلق کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ عامۃ المسلمین کا حق نامزدگی ولایت عہد نے غصب کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ملوک کے استبداد نے اہل حق کی زبانوں پہ تالے ڈال دیئے تھے۔ دور اندیش اہل علم مستقبل کی مشکلات کے تصور سے کانپ اٹھے وہ ان تمام بدعملیوں کو دیکھ رہے تھے جو ایک مستبد نظام سے پیدا ہو سکتی ہیں، حکومت وقت کچھ تملق اور خوشامد پرست علماء میں گھر چکی تھی کہ وہاں حریت پسند ارباب فکر کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی ان کی پروا۔

سرزمین کوفہ ان تمام غلط اور استبدادی مظاہروں کے لیے سرزمین کوفہ بے حد موزوں تھی۔ یہ مشرقی شہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کا صحیح مصداق تھا۔ هُنَالِكَ الزَّلَازِلُ وَالْفِتَنُ وَهُنَالِكَ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ یہ فتنوں اور زلزلوں کی سرزمین ہے۔ یہ زمین شیطان کی سربلندیوں کے لیے آماج گاہ ہے۔ چنانچہ خلافت فاروقی سے شروع ہو کر یہ زمین فسادات اور خطرات کی سرزمین رہی ہے۔ ایک حدیث میں نجد کا ذکر بھی ہے جس سے مراد نجد العراق ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی اس سرزمین میں ظہور پذیر ہوتی رہی۔ حضرت علیؓ اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے خلاف ریشہ دوانیوں کے لیے یہی زمین مرکز بنی رہی۔ خوارج کی اکثر سرگرمیاں بھی اسی سرزمین میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں اور بالآخر فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔

حضرت سعدؓ کے خلاف ایک جھوٹی شکایت اہل کوفہ ہی کی طرف سے کی گئی، فاروق اعظمؓ نے شکایت کو غلط سمجھتے ہوئے بھی حضرت سعدؓ کو بدل دیا اور دوسرا گورنر بھیج دیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کی دوربین نگاہیں اس سنگلاخ زمین کی انتقامی سازشوں سے خوب آگاہ تھیں۔ یوں بھی ایک سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے ضروری تھا کہ یہاں مختلف الخیال ارباب فکر جمع ہوں جو اپنے فکر کی اشاعت کے لیے میدان ہموار کریں دوسرے کے افکار کو توڑیں اور اس تصادم میں ایسے فاسد الفطرت نوجوانوں کا پیدا ہونا قدرتی ہے جو ہر شرارت کے سرغنہ بن سکیں۔

حضرت علیؓ کا مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر کوفہ آنا بھی شاید اسی لیے ہو کہ ان فتنوں پر براہ راست

قالو پاسکیں اور قصہ زمین پر سرزمین نپٹنے میں زیادہ سہولت ہو لیکن یہ انتقال مکانی کی تدبیر اس وقت عمل میں لائی گئی جب کہ معاملہ تقدیر کے ہاتھ میں جا چکا تھا اور تدبیر کی ساری ہوشمندیاں فتنہ انگیزوں کی بدخواسیوں کا شکار ہو چکی تھیں۔

سیدنا الامام | جس قدر یہ زمین سنگلاخ تھی اسی قدر وہاں اعتقادی اور عملی اصلاح کے لیے ایک آئینی آدمی کی ضرورت تھی جس کے علم وعقل کی پہنائیاں اس سرزمین مفاسد کو سمیٹ لیں۔ میری ناقص رائے میں یہ آئینی شخص حضرت امام ابوحنیفہؒ تھے جن کی فقہی موشگافیوں نے اعتزال وتجسم کے ساتھ رفض و تشیع کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اللھم ارحمہ واجعل الجنۃ الفردوس ماواہ۔

حضرت الامام کا سیاسی موقف | حضرت امام رحمہ اللہ کو جہاں دین کے فقہی معاملات میں ایک اعجازی مقام حاصل تھا وہاں وہ وقت کی سیاسیات سے بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ ان مؤثرات کو خوب سمجھتے تھے جن سے ایک غلط حکومت ماحول کو متاثر کر سکتی ہے اس لیے حضرت امام جہاں اپنے دارالافتاء میں مجتہدانہ انداز سے کتاب وسنت کے بعض مقاصد کی تکمیل فرماتے تھے وہاں ایک ماہر سیاستدان کی طرح حکومت وقت کی نارسائیوں اور رکم وریوں سے بھی واقف اور باخبر تھے اور حکومت بھی اس مؤثر شخصیت اور اس کے دور رس اثرات سے واقف تھی۔ حضرت امام کی قوت نفوذ اور عوام میں حضرت امام کی مقبولیت حکومت سے پوشیدہ نہ تھی اور نہ ہی حضرت امام اپنی اس ہمہ گیر قوت سے بے خبر تھے۔ اس لیے ناممکن تھا کہ کوئی موقعہ حضرت امام کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

حضرت امام کے مخالف بلکہ دشمن بھی ان خوبیوں سے ناواقف نہیں تھے اگر اس دور پرفتن میں یہ مقدس شخصیت سرزمین کوفہ میں موجود نہ ہوتی تو شاید اس سرزمین کا حشر عاد وثمود یا قوم لوطؑ جیسا ہوتا۔ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ۔

علامہ زمخشری اعتقاداً مائل باعتزال ہیں لیکن فروع میں وہ حنفی ہیں، فرماتے ہیں۔

وکان ابوحنیفۃ یفتی سرا بوجوب نصرۃ زید بن علی رضی اللہ عنہما وحمل المال الیہ والخروج معہ علی اللص المتغلب المسمی بالامام والخلیفۃ کالدوانیقی و قالت امرأۃ اشرت علی ابنی بالخروج مع ابراھیم ومحمد ابنی عبد اللہ بن الحسن

حضرت امام ابوحنیفہ درپردہ زید بن علی کی مالی اور جانی اعانت کا فتویٰ دیتے تھے۔ اور منصور دوانیقی ایسے چور کے مخالف تھے۔ ایک عورت نے حضرت امام سے فرمایا کہ میرا لڑکا آپ کے فتویٰ کے مطابق محمد اور ابراہیم بن عبداللہ بن حسن کے ساتھ شہید ہو گیا۔ حضرت امام نے فرمایا

حتیٰ تنتل فقال لیتنی مکان ابنك (کشاف ص۱۳۳ سورۃ بقرہ) | کہ کاش میں اس کی جگہ ہوتا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور خلیفہ منصور حضرت امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں (حسب روایت صحیح) پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔ اسی مدت میں اموی حکومت نے دم توڑا۔ اور عباسی حکومت نے اس کی جگہ لے لی۔ اکثر ائمہ اسلام نے اس انقلاب میں کوئی اہم حصہ نہیں لیا، حکومت کے امیدواران کا شخصی کیریکٹر اور اس انقلاب کے اسباب و دواعی ان کے سامنے تھے محض اسلام کے نام پر وہ کسی کے ہاتھ نہیں کھیلے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی نگاہ میں نہ تو مروان الحمار کی ذاتی بردباری قابل تعریف تھی اور نہ ہی عبداللہ السفاح پہلے عباسی بادشاہ کی ہوش مندی میں ان کے لیے کوئی جاذبیت تھی ان کی نظر میں یہ انقلاب ''گاؤ آمد و خر رفت'' سے زیادہ وقیع نہ تھا۔ ائمہ اسلام ان دونوں سلسلوں پر غیر مطمئن تھے۔ حالانکہ یہ دونوں سلسلے بظاہر سنت کا دم بھرتے تھے مگر ائمہ اسلام کی دور اندیش نگاہیں ان کے شخصی اعمال اور اخلاق سے آگاہ تھیں اس لیے وہ بدستور ایک صحیح شرعی اور دینی حکومت کے لیے ساعی اور منتظر رہے۔

ظاہر ہے کہ جب اموی اور عباسی خلفاء کی ظاہری سنیت انہیں مطمئن نہ کرسکی تو وہ کسی رافضی حکومت پر کس طرح مطمئن ہوسکتے تھے۔ یہ ہمارے علماء کی سادگی اور قصور فکر و نظر ہے کہ وہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں بعض غالی اور تبرائی شیعوں کی مدح و ثنا میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے اور پورے ہندوستان میں دورے کرکے اہل توحید اور ارباب سنت کی مخالفت کرتے رہے۔ اپنوں سے دشمنی اور غیروں سے دوستی یہ عجیب سادگی تھی، اس سادگی کا خدا حافظ۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ طمع، تحریص اور رعب و تخویف سے بالا تھے، وہاں مردم شناسی کا جوہر خلفاء اور امراء تک کے اخلاق اور ذاتی معائب پر محیط تھا۔

توازن طبیعت ان مقدس بزرگوں کے مزاج میں اس قدر توازن تھا کہ انتہائی ناگزیر حالات کے باوجود توازن بگڑنے نہیں پایا۔ خلیفہ منصور کی لغزشیں نظر میں تھیں لیکن نظام کے ساتھ وابستگی میں خلل نہیں۔ احکام کی پابندی بھی ہوتی رہی، تنقید کا سلسلہ بھی جاری رہا اہل اور مناسب آدمی کی تلاش اور جستجو بھی رہی۔

قال الخطیب وکیع ان ابا حنیفۃ النعمان بن ثابت کان یتولی القیام بضرب لبن | حضرت امام ابوحنیفہؒ شہر کی اینٹیں بنواتے اور گنتے رہے یہاں تک کہ شہر کی فصیل ختم ہوگئی آہ

المدینۃ وعلادہ حتی فرغ من استتمام بناء
حائط المدینۃ مما یلی الخندق تاریخ بغداد ص ۳۹

اس روایت کی تائید البدایہ والنہایہ سے بھی ہوتی ہے ملاحظہ ہو۔ البدایہ صفحہ ۹۷ جلد ۱۰۔ ابن کثیر
فرماتے ہیں یہ دیوار ۱۴۶ھ میں ختم ہوئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ منصور نے حضرت امام کو عہدہ قضا کے لیے مجبور کیا، حضرت امام نے
انکار فرمایا، منصور نے حلف اٹھایا کہ تمہیں بہرحال حکومت کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا، حضرت
امام نے عارضی طور پر عمارت میں تعاون قبول فرما لیا اس کشیدگی میں ممکن ہے کہ جیل جانے کا مرحلہ
بھی آیا ہو لیکن حضرت امام کے جیل میں انتقال کی خبر چنداں موثق معلوم نہیں ہوتی۔

حضرت امام کی دانشمندی کا تقاضا بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی بہتر آدمی سامنے نہ
آجائے خواہ مخواہ ایجی ٹیشن کیوں کی جائے۔ محض جنگ کے لیے جنگ تو کوئی خوبی نہیں اور نہ ہی
بے مقصد ایجی ٹیشن سے ملک کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، صرف تخریب اور بدامنی سے انقلاب کو
قریب لانا یہ اشترا کی طریق کار ہے اہلِ حق نا گزیر یہ حالات کے بغیر بدامنی کی حمایت نہیں کرسکتے اور
نہ ہی اہلِ علم حق پرست شرفاء کے ساتھ عداوت مول لیتے ہیں۔ بلکہ اہلِ حق فساق اور معصیت پیشہ
لوگوں سے نہ تعلق جوڑتے ہیں اور نہ ہی ان پر اعتماد کرتے ہیں۔

اس لیے حضرت امام ابوحنیفہ منصور سے اختلاف کے باوجود جائز امور میں اس کی اعانت
فرماتے رہے۔ منصور اور ابن ہبیرہ وغیرہ کو امر بالمعروف فرماتے رہے۔ ابن ابی ذئب اور حضرت
امام مالکؒ کی بھی یہی روش رہی، ان حالات میں حضرت امام کی موت کا مسئلہ بصورت قید
غور طلب ہے۔

محمد بن عبداللہ بن حسن

محمد بن عبداللہ کو اہلِ مدینہ نے توجہ دلائی بلکہ مجبور کیا کہ وہ منصور
کی حکومت کے خلاف تحریکِ حریت کی قیادت فرمائیں اور جس قدر جلد ممکن ہو اس نظام کو ختم
کیا جائے۔ خلیفہ منصور خلفاء عباسیہ میں سے دوسرے خلیفہ ہیں اپنے بھائی سفاح کی موت کے بعد
مسندِ خلافت کو ۱۳۶ھ میں زینت بخشی منصور بڑا ہشیار اور فصیح البیان اور لسان مقرر تھا۔
محمد بن عبداللہ سے اس کی مکاتبت اس کی ادبی مہارت پر زندہ شاہد ہے۔

لیکن اس کے دینی رجحانات سفاح سے بہتر نہ تھے۔ مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس
نے اپنے مخالفین پر کڑی نگرانی کی اور لطیف حیلوں سے ان کو مروا دیا، ان سیاسی دشمنوں میں اچھے اور

برے سب لوگ شامل تھے اس لیے آئمہ اسلام کی ایک صحیح شرعی نظام کے لیے تشنگی ایک قدرتی امر تھا۔ امن و اطمینان کے لیے ضروری تھا کہ ایک دینی نظام ملک کے طول و عرض میں کار فرما ہو اس کام کے لیے محمد بن عبداللہ بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم زیادہ موزوں معلوم ہوئے اور ان کی حکومت کے لیے خفیہ کوششیں شروع ہوئیں۔ یہ پورا خاندان حکومت کی نظروں میں معتوب ٹھہرا۔ محمد اور ان کا بھائی ابراہیم دونوں روپوش ہو گئے، محمد تو مدینہ منورہ ہی میں رہے اور ابراہیم بصرہ میں چلے گئے۔ اور ان کے بہت سے اعزہ واقربا بڑی مسکنت کی موت مرے۔ یہ سانحہ بھی کربلا سے کچھ کم نہیں۔ معلوم نہیں مظلوموں کے حامی یہاں کیوں خاموش ہیں۔

محمد بن عبداللہ کے مذہب کے متعلق آئمہ تاریخ اور رجال نے صراحت نہیں فرمائی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھے اس کے مندرجہ ذیل قرائن ہیں۔

(۱) محمد بن عبداللہ نے اپنی تحریک کا آغاز مدینہ منورہ سے کیا اور مدینہ کے لوگوں نے ہی انہیں اس پہ آمادہ کیا یہاں تک کہ وہ اس پہ آمادہ ہو گئے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

لم یزل الناس اهل المدینة وغیرهم یؤنبون محمد بن عبد الله فی اختفائه وعدم ظهوره حتی عزم علی الخروج (البدایہ ص۸۳ ج۱۰)

اہل مدینہ اور دوسرے لوگ محمد بن عبداللہ کو اس کی روپوشی پہ ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ اس نے حکومت کی مخالفت کا قطعی فیصلہ کر لیا اور وہ میدان میں آ گئے۔

(۲) امام مالکؒ نے ان کی حمایت کا فیصلہ کیا اور لوگوں کو ان کی حمایت کے لیے کہا۔

قد روی ابن جریر عن الامام المالک انه افتی الناس بمبایعته فقیل له فان فی اعناقنا بیعة للمنصور فقال انما کنتم مکرهین ولیس لمکره بیعة (البدایہ ص۸۴ جلد۱۰)

امام مالکؒ نے محمد بن عبداللہ کی بیعت کا فتویٰ دیا لوگوں نے کہا ہم منصور کی بیعت کر چکے ہیں۔ امامؒ نے فرمایا وہ جبراً تھی اور جبری بیعت کا کوئی اثر نہیں۔

(۳) حضرت امام ابو حنیفہؒ نے بھی ان کی حمایت کی، گویا اصحاب مدینہ اور علماء کوفہ دونوں ان کی تائید میں متفق تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں امام اور ان کے رفقاء رفض کی حمایت پر کیسے جمع ہو سکتے تھے، اور اگر خلاف سنت نظام ہی کو اختیار کرنا ہوتا تو پھر منصور اس سے بہتر تھا۔

(۴) اولاد مروان الحمار کے عہد حکومت میں عبداللہ بن حسن کی بیعت خود خلیفہ منصور کر چکا تھا اور معلوم ہے کہ عباسی امراء میں رفض کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

(۵) محمد بن عبداللہ نے اپنا نائب عثمان بن محمد بن خالد کو مقرر کیا اور قاضی عبدالعزیز بن مطلب کو اور

پولیس کا محکمہ عثمان بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب کے سپرد کیا اور دیوان العطاء پر عبداللہ بن جعفر بن عبداللہ کو مقرر فرمایا۔ ان تمام حضرات میں کوئی بھی رافضی یا شیعہ نہیں۔

(۶) ان کے اساتذہ کا تذکرہ حافظ ابن کثیرؒ نے صـ۹۲ میں کیا ہے، ان میں کوئی بھی شیعہ نہیں۔ مثلاً عبداللہ، نافع، ابوالزناد، نسائی اور ابن حبان نے انہیں ثقہ فرمایا ہے۔

حافظ ابوعوانہ نے انہیں خارجی فرمایا ہے لیکن یہ خارجی مذہبی نسبت نہیں بلکہ غالباً منصور کے خلاف خروج کی وجہ سے لغۃً خارجی کہا گیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں بھی ابوعوانہ کا یہ قول ذکر فرمایا ہے اور اسے رد کر دیا ہے۔

(۷) خود شیعہ حضرات نے بھی محمد بن عبداللہ کو نہ سیاسی اہمیت دی ہے نہ دینی، بلکہ شیعی نوشتوں نے انہیں اور ان کی تحریک کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا اور حضرت مولانا محمد ابراہیم سے بہتر کون جانتا ہے کہ قدماء اہلِ بیت میں سے کوئی بھی شیعہ نہ تھا، شیعہ فرقہ بالمعنی المتعارف المصطلح صدیوں بعد کی پیداوار ہیں۔ گو اہلِ بیت نبوت رضوان اللہ علیہم اجمعین اس وقت کے رفقاء سے بھی خوش نہ تھے اور نہ ہی اس وقت کے شیعہ حضرات نے ان بزرگوں کا صحیح طور پر ساتھ ہی دیا بلکہ تقیہ کے غلط مفہوم نے انہیں ہمیشہ مستور اور مخفی رہنے کی عادت ڈال دی اور وہ کبھی کھل کر اہلِ بیت کی اعانت نہ کر سکے۔

حضرات بزرگانِ اہلِ بیت نے با دلِ نخواستہ یہ رائے قائم فرمائی کہ نحن لقتنا شیعتنا، غرض یہ شیعیت مذہبی اور سیاسی سے زیادہ سیاسی شیعیت تھی، اس لیے محمد بن عبداللہ کی حمایت اور ائمہ اسلام کی ان کے ساتھ ہمدردیاں وحدتِ خیال ہی کی بناء پر تھیں۔ ایک شرعی اور دینی نظام کی تشکیل کے لیے تھیں، اس کا تعلق شیعہ سنی وحدت سے نہیں تھا بلکہ اگر یہ تحریک محمد بن عبداللہ کے علاوہ کوئی سا آدمی بھی شروع کرتا جس کا تعلق اہلِ بیت سے نہ ہوتا تو بھی ائمہ اسلام اس کی گرد راہ کو آنکھوں کا سرمہ بناتے۔

عبداللہ بن حسن بن حسنؒ مشہور تابعی ہیں اپنے والد اور حضرت فاطمہ بنتِ حسین اور عبداللہ بن جعفر سے ان کا سماع ثابت ہے۔ کتب رجال میں پورے خاندان میں سے کسی کے متعلق بھی تشیع کا شبہ نہیں کیا گیا۔ عبداللہ بن حسن کے تلامذہ میں سفیان ثوریؒ اور امام مالکؒ کا ذکر کیا گیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ ان کا احترام فرماتے تھے۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں ثقہ صدوق ابراہیم بن عبداللہ کا تذکرہ رواۃ حدیث میں نمایاں نہیں ہے۔

غرض پورے خاندان میں تشیع کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ائمہ اسلام کا تعاون ایک اصولی تعاون تھا، چنانچہ پچھلے انتخابات میں مولانا محمد ابراہیم صاحب نے کرامت علی صاحب کی اعانت فرمائی۔

ہم جانتے ہیں کہ مولانا شیعہ نہیں، نہ ہی شیعہ کو حق پر سمجھتے ہیں، صرف سیاسی نظریہ میں مولانا کو کرامت علی صاحب

سے اتفاق تھا اس لیے مولانا نے ہندوستان بنارس وغیرہ میں اپنے محسنوں سے بگاڑ لی۔ یہاں پر کرامت علی صاحب کے لیے اپنے پرانے ساتھیوں سے برسرپیکار ہو گئے اور گوجرانوالہ ہر دو دفعہ حملہ آور رہے۔

اب بھی شاید وہی اثر ہے کہ مولانا کا رجحان اہل تشیع کی طرف روز بروز بڑھ رہا ہے۔ تعجب ہوا کہ بقول "در نجف" مولانا "در نجف" اپنی مسجد میں تقسیم فرماتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آخر عمر میں یہ رجحانات افسوسناک ہیں۔ الاعتصام پر ناراضگی کے لیے کچھ غلط یا صحیح وجہ یہ بھی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ مولوی عبدالمجید صاحب مدیر جریدہ اہل حدیث سوہدرہ منتیں کرتے مارے گئے اور یزیدی روح سے ممتاز فرما دیئے گئے۔

محتسب کا نام بھی آ گیا زیرِ احتساب
مجلسِ اہلِ جام میں منکرِ جام آ گیا

انتہی

الاعتصام: ۳۱ راگست ۲۱ ستمبر ۱۹۵۱ء

ہماری سرگزشت
آئندہ تبلیغی مسائل گزشتہ حوادث کی روشنی میں

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

سماک بن حرب نے سمرہ بن جندبؓ سے دریافت فرمایا، کیا آپ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (خاص) مجلس میں بیٹھا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا، ہاں! آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک نماز گاہ میں تشریف رکھتے تھے اور صحابہ جاہلیت کی عادات کا تذکرہ کر کے ہنستے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تبسم فرماتے اھ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۳۵)

زیر قلم گزارشات سے نہ گلہ مقصود ہے نہ کسی کی تنقیص، وقت گزر چکا ہے۔ ان حوادث پر تقریباً سو سال گزر رہا ہے۔ اس وقت کے مدعی اور مدعا علیہ دونوں اس عدالت میں پہنچ چکے ہیں جہاں ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور یقیناً اپنے اعمال کے نتائج سے باخبر ہو چکے ہوں گے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض

ماضی کے حوادث کبھی مستقبل میں رونما ہوں تو اپنے اس وقت کے لوگ حیران نہ ہوں بلکہ جرأت سے حق کا ساتھ دیں تاکہ کسی کی بڑائی حق کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔

نیز دین جیسی پسندیدہ اور مقدس چیز میں جب تعصب آجائے تو انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ بڑے سے بڑا آدمی ایسی باتیں کر گزرتا ہے جن کی اس سے امید نہیں ہوتی اگر کبھی آپ اپنی تاریخ پر غور فرمائیں گے تو آپ صحابہؓ کی طرح ان حرکات پر ہنسیں گے خصوصاً وہ حضرات جن کے بزرگوں نے کبھی کسی مسلک کے خلاف حصہ لیا تھا لیکن اس کے بعد خدا نے ان کی رہنمائی فرمائی۔

میں خود سوچتا ہوں کہ مسلکِ اہلِ حدیث سے اختلاف کی گنجائش نہیں، ممکن ہے تحقیق سے ان کی بعض فروع کمزور ثابت ہوں لیکن مسلک کے ساتھ بغض کی کوئی وجہ نہیں۔ معلوم ہے کہ اس وقت بھی اچھے پڑھے لکھے حضرات اس مسلک سے نفرت کرتے ہیں۔ تقریر و تحریر دونوں میں اس نفرت کا اظہار ہوتا ہے اس کا سبب یہی غلط فہمی اور بغض ہے جس سے ہمارا اور ہمارے اکابر کا مدت سے سابقہ رہا ہے۔

اہلِ حدیث اور آئمہ حدیث | اہلِ سنّت کے مکاتبِ فکر ابتدا ہی سے دو چلے آرہے ہیں اہلِ حدیث اور اہل الرائے۔ شیخ عبدالقاہر بغدادی ۴۲۹ھ فرماتے ہیں۔

والصنف الثانی منهم ائمة الفقه من فریق الرأی والحدیث من الذین اعتقدوا فی اصول الدین مذاهب التفویض فی الله وصفاته (ص ۳۰۱ الفرق بین الفرق)

دوسری قسم فقہائے کرام کی ہے۔ جن میں اہل الرائے اور اہلِ حدیث دونوں شامل ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات میں تفویض کے قائل ہیں (الخ) یہ دونوں گروہ اہلِ سنت ہیں اور یہ لوگ صفات باری میں تفویض کے قائل ہیں۔

فرق صرف اسی قدر ہے کہ حضرات اہل الرای کتاب وسنت کے فہم میں مخصوص اہلِ علم کے آراء اور افکار کا تتبع کرتے ہیں۔ اہلِ حدیث کی روش میں کسی قدر وسعت ہے — وہ کتاب وسنت کے فہم میں سلف صحابہ کے پورے دور اور ان کے افکار کو سامنے رکھتے ہیں اور حضرات صحابہ سے کسی کے آراء وافکار سے بھی تطابق ہو جائے وہ اسے گوارا کرتے ہیں۔ یہ مسلک ہمیشہ دنیا میں رہا ہے۔ اختلاف کے باوجود یہ دونوں فریق ایک دوسرے کی تکفیر یا تضلیل نہیں کرتے۔ ان کے ہاں اختلافی فروع میں ترجیح تو ہوتی ہے، تکفیر تفسیق اور تضلیل نہیں ہوتی۔

مسلک کی قدامت | یہ مسلک آئمہ اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی پہلے کا ہے۔ لیکن زمانہ کے انقلابات، سیاسی مصالح اور عروج وزوال کے مختلف مراحل سے گزرنے کی وجہ سے عددی قلت

اور کثرت سے متاثر ہوتا رہا۔ قرونِ خیر کے بعد عموماً حکومت سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے اہلِ حدیث اقلیت ہی میں رہے لیکن خودداری زندگی اور خدمتِ حدیث کی وجہ سے علمی حلقوں میں ائمہ حدیث ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ فروعی عملیات میں حنفی مسلک کے پابند تھے لیکن نظریات میں اہلِ حدیث سے بہت زیادہ قریب تھے۔ دسویں صدی کے بعد ہندوستان میں مسلکِ اہلِ حدیث کے شیوع کے دو سبب ہیں (۱) فقہ حنفی اور اس کے متوسلین میں انتہائی جمود اور تصلب ۔۔۔ (۲) حضرت مجدد الفِ ثانی سے لے کر حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تک اس جمود و تصلب پر محقق اہلِ علم کی تنقید ۔۔۔ یہ حضرات عموماً اپنے متعلق اظہار فرماتے تھے کہ وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو اپنا مقتدا اور امام سمجھتے ہیں لیکن فقہ مروجہ اور اس کی جزئیات پر ان کی محققانہ تنقید کی شہادت ان کی تصانیف سے ملتی ہے۔ بدعات کے خلاف ان کی تصانیف میں بھرپور حملے موجود ہیں۔ آج کل کے حضرات علمائے دیوبند اور بریلوی حملہ آوروں کی روش کو دیکھنے والا، حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو غیر مقلد سمجھے گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات حنفی تھے لیکن ان میں جمود نہیں وہ محقق تھے۔ ان میں تقلیدی تصلب نہیں تھا۔ اللھم اغفر لھم وارحمھم واجعلھم من ورثۃ جنۃ النعیم۔

شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اسی حرکت کا نچوڑ تھے جس کی ابتدا حضرت مجدد الف ثانی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے ان تمام نظریات کو عمل کی صورت عطا فرمائی جو اس سے پہلے واقعی علم ونظر کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ شاہ صاحب نے سیاسیات میں اپنا مطمح نظر اسلامی حکومت قرار دیا اور شرک و بدعت کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ فرمایا اور تقلید و جمود پر کاری ضرب لگائی۔ صراطِ مستقیم کے بعض مقامات تذکیر الاخوان اور اس سے پہلے حجۃ اللہ کے بعض اجزا، عقد الجید اور الانصاف میں یقیناً تحقیق ونظر کی دعوت ہے اور تقلید و جمود کے خلاف جذبات کو اس سے خاصی اعانت ملتی ہے۔

اس لیے یقین فرمایئے کہ اس دور انحطاط میں مسلکِ اہلِ حدیث کے احیا کا شرف ان حنفی بزرگوں کو حاصل ہے جن کو تقلید و جمود سے نفرت تھی وہ حنفیت کو محض تقلیدی مسلک نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ فشکر اللہ مساعیھم۔

شہیدؒ کے بعد ۶؍مئی ۱۸۳۱ء مطابق ۲۴؍ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ جمعہ کے دن شاہ شہیدؒ نے مع رفقاء جامِ شہادت نوش فرمایا یہ تحریک اپنے سیاسی مقاصد کے لحاظ سے بظاہر ناکام ہوگئی لیکن سکھوں کی کمر توڑ گئی۔ تھوڑے عرصہ میں سکھ کمزور ہوگئے۔ پورے پنجاب پر انگریز قابض ہوگئے ۔۔۔ تحریک کا کام انگریزی علاقہ میں خفیہ ہوگیا لیکن سرحدی علاقہ میں انگریزوں سے برسوں تک دو بدو جنگ رہی۔ متحدہ ہندوستان میں اس

جماعت پر انگریز نے کئی سازش کیس بنائے۔ عمر قید اور پھانسی تک کی سزائیں دیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔

امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی مرحوم نے کشمیر کے محاذ پر اپنی بساط کے مطابق حکومتِ پاکستان کی مدد کی اس کے باوجود کوئی شبہ نہیں کہ انگریز کی طاقت مضبوط تھی جماعت اس کا مقابلہ دست بدست نہیں کر سکی جو ہوا انڈر گراؤنڈ اور خفیہ ہوا۔

سنہ ۱۲۴۶ھ کے بعد اہلِ علم کی زیادہ توجہ علمی مشاغل کی طرف ہو گئی۔ دیوبند، سہارن پور اور دہلی میں اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مدارس جاری ہو گئے اور فقہ و حدیث کی تدریس شروع ہو گئی۔ اس وقت میاں صاحب یعنی شیخ الکل سید نذیر حسین کا مدرسہ زیادہ بارونق اور فعال تھا۔ اکیلے وجود نے ڈھیر سارا کام کیا۔ عرب و عجم تک میاں صاحب کے اثرات اس قدر پہنچے کہ شاید کوئی یونیورسٹی بھی اتنا اثر نہ پیدا کر سکتی۔ عرب و عجم تک ان کے تلامذہ پھیل گئے۔ نیپال کی ترائیوں تک یہ نورِ مبین ضیا پاش رہا۔

مخالفت کا آغاز یہ معلوم نہیں ہو سکا، مخالفت کا آغاز کب ہوا، کس نے کیا؟ فروع میں اختلاف بہت پرانا تھا اور وہ بھی شوافع، موالک، حنابلہ رحمہم اللہ سے زیادہ سنگین نہ تھا اس لیے اس تیزی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ائمہ اربعہ کے اتباع ایک دوسرے کو حق پہچانتے تھے۔ اہلِ حدیث کا مسلک عملاً ائمہ اربعہ سے چنداں مختلف نہیں۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ شوافع اعمالِ مسنونہ حضرت امام شافعیؒ کی اتباع میں کرتے ہیں، اہلِ حدیث ان اعمال کو سنت سمجھتے ہیں اور اتباعِ سنت کے جذبہ سے کرتے ہیں اور یہ کوئی ایسی لغزش نہیں جس پر اس قدر ناراضگی کا اظہار کیا جائے۔ آخر ائمہ محققین نے مروجہ تقلید کو زیادہ سے زیادہ اباحت کا مقام دیا ہے۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ یہ وقت کا بہت بڑا المیہ تھا۔۔۔ میری نظر میں اس دور کے قریباً سات رسائل ہیں جو اتفاقاً ہاتھ لگے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک کو کن تکلیف دہ حالات سے سابقہ پڑا۔

نام کتاب	زمانہ تصنیف	مصنف
۱۔ کلام سلیم لدفع بہتان عظیم	سنہ ۱۳۰۰ھ	مولوی عبد الحق صاحب یکے از رفقاء سید نذیر حسینؒ
۲۔ جامع الشواہد لاخراج الوہابیین من المساجد	سنہ ۱۲۹۸ھ قریباً	مولوی وصی احمد صاحب سورتی مع مواہیر علماءِ کرام
۳۔ صیانۃ المومنین عن تلبیس الملبِّسین	سنہ ۱۳۰۰ھ	مولانا حبیب اللہ صاحب میواتی علاقہ بھرت پور جامع الشواہد کا جواب۔
۴۔ عمارۃ المساجد بہدم اساس		مولانا محمد سعید صاحب گنجاہی بنارسی

نام کتاب	زمانہ تصنیف	مصنف
جامع الشواہد	۱۳۰۰ھ	جامع الشواہد کا جواب
۵۔ کاشف المکاید...... من منع عن المساجد	۱۳۰۰ھ	مولانا عبدالغنی صاحب جونا گڑھی جامع الشواہد کا جواب
۶۔ انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد	۱۳۲۸ھ	لدھیانوی خاندان (عبدالقادرؒ، عبدالعزیزؒ، محمدؒ)
۷۔ اشاعۃ السنۃ	۱۳۰۱ھ	مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی)
۸۔ نصرۃ الابرار	۱۳۰۶ھ	مولوی عبدالعزیز و مولوی محمد لدھیانوی بن مولانا عبدالقادر صاحب لدھیانوی

یہ کتابیں چھوٹے چھوٹے رسائل کی صورت میں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداءً تحریک میں ...... اکابر اہلِ حدیث کو کن حالات سے سابقہ پڑا اور اختلافات نے کتنی ناہموار صورت اختیار کی۔

بریلوی حضرات کی مخالفت سے تو تعجب نہیں تعجب اس پر ہوتا ہے کہ حضراتِ دیوبند جو جانتے تھے کہ یہ اختلافات فروعی ہیں اور ناگزیر اور قرونِ خیر سے اہلِ علم کی آراء ان میں مختلف رہی ہیں۔ اسی طرح تقلیدِ شخصی کا التزام محض ایک مصلحت ہو سکتی ہے اس میں شرعی لزوم کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ حضرات اس علم و فہم کے باوجود مخالف حلقوں میں کھڑے ہو گئے ان کی اس روش سے دوسرے فریق کو بہت زیادہ مدد ملی پھر یہ اختلافات مدارس اور علمی حلقوں (جوان کا اصل مقام تھا) سے نکل کر حدیثِ محفل بن گئے۔ پریس اور اخبارات کی زینت بنے۔ مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم ایسے بزرگوں کا تختۂ مشق بنے جہاں وہ تقریر، تحریر، رنگینیٔ محفل کے سوا اور کچھ نہ تھے۔ الخیر فیما وقع کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

اِن رسائل میں کیا ہے؟

"کلام سلیم لدفع بہتان عظیم" میں ایک چٹھی کا ذکر ہے۔ یہ چٹھی مولانا سید شریف حسین صاحب رحمہ اللہ، مولانا سید محمود صاحب امام جامع مسجد دہلی، مولوی عبدالمجید صاحب اور مرزا عبدالعزیز صاحب کی طرف سے مولوی ولایت علی صاحب فرخ آبادی مدرس کے نام لکھی گئی ہے پھر اسے چھپوانے کے بجائے بذریعہ نقول اس کی اشاعت کی گئی ہے تاکہ قانون کی زد سے بھی بچا جائے اور فتنہ بھی ابھر سکے۔ یہ فتنہ ۱۲۹۸ھ میں بپا ہوا اور اس کی وجہ سے جا بجا لڑائی اور ہنگامے ہوئے۔

چٹھی کا مضمون

یہ چٹھی واقعی ایک آگ تھی جو کسی بدتمیز نے سلگائی اگر جلدی سے اس کا سدِ باب نہ ہوتا تو نہ معلوم فتنہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا — یہ چٹھی بعینہٖ اس وقت طبع شدہ میرے پاس موجود ہے

جو اہلِ حدیث کی طرف سے مع تردید طبع کرائی گئی۔ اس کا مضمون اس قدر تکلیف دہ ہے کہ آج بھی اسے نقل کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کس بدتمیز نے یہ مضمون بنایا اور اہلِ حدیث کی طرف منسوب کرنے کی اسے کیسے جرأت ہوئی۔ ناظرین اقتباس پہ کفایت فرمائیں۔

۱۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خنزیر کی چربی سے ملا ہوا پنیر بلا پرسش و تحقیق کھالیا۔

۲۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی سب مرتد اور کافر ہیں۔

۳۔ تمام صوفی مثل خواجہ معین الدین، شیخ عطار، نظام الدین، شیخ عبدالقادر جیلانی کافر ہیں اور جہنمی۔

۴۔ فقہ حنفیہ کی کتابیں ہدایہ وغیرہ گمراہ کن کتابیں ہیں۔

۵۔ نقشبندی، سہروردی، چشتی، قادری اسلام سے خارج اور واجب القتل ہیں۔

۶۔ بیس تراویح کی بدعت حضرت عمرؓ نے ایجاد کی۔

۷۔ بیت اللہ میں شرک ہوتا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی طرح تمام قبروں کو گرادینا چاہیے۔

۸۔ امام اعظم (معاذ اللہ) کافر ہیں، شیخ عبدالقادر (معاذ اللہ) جھوٹے ہیں۔

۹۔ مولانا روم، مولانا جامی، سعدی، امیر خسرو، نظامی، بہاء الحق سب کافر تھے۔

۱۰۔ سید نذیر حسین صاحب، مولانا شہید رحمہم اللہ تمام آئمہ اہل اللہ، اولیاء اللہ سے افضل ہیں۔

۱۱۔ محمد شاہ اور منصور علی ملعون ہیں۔ وغیر ذلک من الخرافات والاباطیل۔

اس قسم کی بے ہودہ فواحش سے جو خطرات اور مفاسد ہو سکتے تھے وہ ایک عقل مندمندین سے مخفی نہیں۔ شکر ہے کہ اہلِ حدیث کی طرف سے اس کے متعلق اس نوعیت کی کوئی جوابی حرکت نہیں ہوئی۔ بلکہ میاں صاحب مرحوم کے ایک شاگرد مولوی عبدالحق صاحب نے حالات کی تحقیق فرمائی۔ مولانا سید شریف حسین، سید محمود، مولوی عبدالمجید صاحب، اور مولوی عبدالعزیز صاحب کے نام خط لکھ کر دریافت فرمایا کہ کیا یہ آپ حضرات کی چٹھی ہے؟ پہلے تین حضرات نے تردیدی جوابات بھیج دیئے ـــــ مولوی عبدالعزیز صاحب کے متعلق معلوم نہ ہوسکا یہ کون بزرگ ہیں۔

رسالہ کلام سلیم میں ان حضرات کے مکاتیب نقل کر دیئے گئے ہیں، ان حضرات نے صراحۃً اکثر الزامات سے برأت کا اظہار فرمایا ہے جو مختلف فیہ مسائل تفصیل طلب تھے ان پر علمی طور پر گفتگو کی ہے اور اپنے موقف کی وضاحت فرمائی ہے۔ بعض جگہ مناظرانہ انداز سے مخالفین سے الزامی گفتگو بھی کی ہے۔ رسالہ کافی دلچسپ

ہے اور اچھے معلومات کا ذخیرہ۔

تعجب ہے کہ تعصب انسان کو کس قدر پستی میں گرا دیتا ہے۔ فروعی اختلافات میں اہل علم اپنے مقام سے اس قدر نیچے آجاتے ہیں جن سے ان کی علمی شان اور ثقاہت یقیناً مجروح ہوتی ہے لیکن اس کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ قرآنِ عزیز میں یہود کا یہ جملہ پڑھ کر تعجب ہوتا تھا:

آمِنُوا بِالَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران ۷۲) | صبح اہل ایمان کے نظریات کا اعتراف کرلو اور بعد دوپہر ان کا انکار کر دینا تاکہ عامۃ المسلمین اشتباہ اور تذبذب میں مبتلا ہو جائیں۔

ملک میں پارٹی بازی ہو، حکومت اجنبی ہو، اس قسم کے خلفشار سے اسے فائدہ پہنچتا ہو، حکومت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس قسم کی جعلسازیاں کی جائیں اور پھر اسی اقلیت کو الزام دیا جائے کہ یہ انگریز کے حامی ہیں۔ مالکم کیف تحکمون۔

سید محمد نذیر حسین رحمہ اللہ کا سینہ ایک سمندر معلوم ہوتا ہے جس میں یہ سب تلاطم سما رہے تھے اور کوئی صدائے بازگشت ادنیٰ تموج کا موجب بھی نہیں ہو سکی۔ رحمہ اللہ وجعل الجنۃ الفردوس ماواہ

ایک اور واقعہ اسی رسالہ کے شروع میں ایک واقعہ مرقوم ہے۔ اس وقت کوئی صاحب مولوی عبدالغفور موحدانہ خیالات رکھتے تھے ان کے نام سے چند مسائل مطبع حنفی دہلی سے طبع کرا کر شائع کرا دیئے گئے۔ یہ مسائل بھی سن لیجیے۔

۱۔ پھوپھی سے نکاح درست سمجھتے ہیں (اہل حدیث)

۲۔ خنزیر کی چربی کو پاک سمجھتے ہیں۔

۳۔ پاخانہ پاک سمجھتے ہیں۔

۴۔ منی میں شکر ملا کر کھانا حلال جانتے ہیں ـــ وغیر ذلک من الخرافات۔

یہ واقعہ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ کا ہے۔ اس سے شہر دہلی میں کہرام سا مچ گیا۔ حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب تک اس ماجرا کی اطلاع پہنچی۔ مرحوم اس سے بالکل بے خبر تھے۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر تحقیق کی گئی تو میاں عبدالرشید صاحب مالک حنفی پریس نے بیان فرمایا کہ یہ اشتہار میرے پاس حنفی پریس میں چھپے ہیں۔ میرے پاس مولوی محمد شاہ[1] اور ان کے شاگرد عبدالغفور آئے اور اس فتویٰ کو بصورت اشتہار شائع کرنے کی فرمائش

---

[1] یہ محمد شاہ میاں صاحب کے شاگرد ہیں۔ مدار الحق کے مصنف ہیں۔ ہر شرارت آمیز کوشش میں جو اس وقت توحید وسنت کے خلاف کی گئی اس شریف انسان کا دخل ہے۔ جامع الشواہد وغیرہ ایسی فساد انگیز کتابوں پر ان کے دستخط ہیں

کی۔ یہ اشتہارات ایوانِ حکومت تک بھی پہنچے۔

کمشنر دہلی نے ذاتی طور پہ اس کذب نوازی کو ناپسند کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جائے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ اہلِ حدیث بحیثیت مدعی استغاثہ کریں۔ حضرت میاں صاحب اوران کے رفقاء سے کوئی بھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ میاں صاحب کی افتادِ طبیعت عام لوگوں سے مختلف تھی وہ انگریزی عدالتوں پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت میں وقت گزارنا ناگزیر تھا لیکن اس ملک کے عدالتی نظام کو عام اہلِ حدیث کی طرح طاغوتی نظام سمجھتے تھے۔ استغاثہ تو دائر نہ کیا جاسکا لیکن کمشنر نے اپنے غیر معمولی وسائل سے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کو جمع کر کے ایک معاہدہ مرتب کیا جس میں ہر فریق نے ان مختلف فیہ مسائل میں رواداری اور ایک دوسرے کی اقتداء کے جواز کا عہد کیا۔ یہ معاہدہ سرکاری وغیر سرکاری ذرائع سے عام تقسیم کیا گیا اور اس سے ہیجان فرو ہوا اور امن پسند لوگوں کو کافی فائدہ ہوا اس معاہدہ پہ محمد شاہ کے بھی دستخط ہیں۔

اس معاہدہ پہ ہر فریق کے اکابر علماء اور بااثر حضرات کے دستخط اور مواہیر ہیں اس کی اشاعت سے کافی سکون ہوا، معاملہ فہم حضرات مطمئن ہو گئے۔

جامع الشواهد یہ سکون ان حضرات کو ناپسند تھا جو فساد اور ہنگامہ آرائی کو اپنا ذریعہ معاش سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ عوام کے ذہنوں کو مغالطوں میں مشغول اور مبتلا رکھا جائے چنانچہ معاہدۂ کمشنری کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ایک نیا ہنگامہ بپا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ کمشنر صاحب کے سامنے جو معاہدہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء نے کیا ہے وہ ایک باہم گفتگو ہے وہ کوئی شرعی فیصلہ نہیں ہے اس کی بنا پہ تفسیق وتکفیر کے فتوے رد کیے جاسکتے ہیں نہ اس معاہدہ کی پابندی ہی ہم پہ ضروری ہے۔

اس کے بعد ایک رسالہ "جامع الشواهد فی اخراج الوہابیین عن المساجد" شائع کیا گیا اس میں ان لوگوں کے دستخط اور مہریں بھی شائع ہوئی ہیں جو کمشنر صاحب کے سامنے ایسی خرافات سے اجتناب کا عہد کر چکے تھے۔ مولوی محمد شاہ کے دستخط بھی اس پہ موجود ہیں۔

یہ چند اوراق کا ایک فتویٰ ہے جو مولوی وصی احمد صاحب سواتی نے مدراس سے شائع کیا۔ یہ غالباً زرد رنگ کے کاغذ پہ طبع ہوا تھا۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے اس پہ "زرد رد" کی پھبتی کسی ہے۔ اس کے بعد محمد عارف صاحب تاجر سواتی نے مطبع گلزار محمدی لاہور سے اسے شائع کیا۔ اس

دگزشتہ سے پیوستہ) حضرت الامام شیخ العرب والعجم مولانا سید نذیر حسین صاحب نے معیار الحق کے ابتدا ہی میں ان حضرت کا تذکرہ فرمایا ہے یہ شیخ محمد شاہ پیر سکندرہ ضلع پاک پتن (اب پاک پتن ضلع منٹگمری میں شامل کر دیا گیا ہے) کے رہنے والے تھے۔

فتوٰی کے مفتی حضرات نے اکیس وجوہ کی بنا پر ثابت کیا ہے کہ اہلِ حدیث کو مساجد سے نکالنا درست بلکہ ضروری ہے۔

مفتی صاحبان نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اہلِ حدیث کو خارج از اہلِ سنت اور مساجد سے نکالنے کا فتوٰی دیا ہے۔

۱۔ خدا کا جھوٹ بولنا ممکن جانتے ہیں۔

۲۔ ان کے ہاں انبیاء احکام کی تبلیغ میں بھول سکتے ہیں۔

۳۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین نہیں مانتے۔

۴۔ احاد احادیث سے معجزات کا اثبات جائز نہیں سمجھتے

۵۔ اجماع کو بلا سند حجتِ شرعی نہیں مانتے۔

۶۔ قیاس کو حجتِ شرعی نہیں مانتے۔

۷۔ مسئلہ رجعت کے قائل ہیں (جیسے شیعہ)

۸۔ اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے معاملہ میں غلطی پر سمجھتے ہیں۔

۹۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی تھی۔

۱۰۔ ائمہ اربعہ اور صوفیہ کو ماننے والے کافر ہیں۔

ان عقائد کو اہلِ حدیث کے ذمہ لگا کر اہلِ حدیث کو اہلِ سنت سے خارج قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد گیارہ نزاعی مسائل اپنے فتوٰی کی تائید میں ذکر کیے ہیں۔

۱۔ پانی کتنا ہی کم ہو، نجاست سے جب تک اس کے اوصافِ ثلاثہ نہ بدلیں پلید نہیں ہوتا۔

۲۔ اہلِ حدیث کے نزدیک شیرخوار بچے کا پیشاب پاک ہوتا ہے۔

۳۔ پاؤں پر مسح فرض سمجھتے ہیں۔

۴۔ استنجاء کرنا بدعت ہے۔

۵۔ جماعت سے انزال نہ ہو تو غسل کے بغیر نماز پڑھ سکتا ہے۔

۶۔ تیرہ رکعت سے زیادہ نفل اور ثلث رات سے زیادہ قیام بدعت ہے۔

۷۔ تجارت کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں اس طرح بھینس اور بھیڑ میں زکوٰۃ فرض نہیں جانتے۔

۸۔ سوتیلی خالہ سے نکاح درست سمجھتے ہیں۔

۹۔ ایک سے زیادہ طلاقیں ایک وقت میں دی جائیں تو ایک ہی واقع ہوگی۔

۱۰۔ مرد کے لیے سونے کے سوا باقی زیور درست ہے۔

۱۱۔ پنیر میں سؤر کی چربی ملی ہوتی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلا تحقیق استعمال فرما لیتے۔

ان اکیس وجوہ کی بنا پر فتوٰی دیا گیا ہے کہ اہلِ حدیث کو مساجد سے نکال دیا جائے۔ اور یہ اہلسنت نہیں ہیں۔

سنہ ۱۳۰۰ھ کے پس و پیش اس کتاب کی مدراس سے پشاور تک اشاعت ہوئی اور اس پر کافی ہنگامہ ہوا جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے جواب میں اسی وقت کئی کتابیں لکھی گئیں بعض میں تحقیق ہے بعض میں الزام، بعض میں تلخی ہے بعض میں متانت ـــــ چار رسائل اس وقت میرے پاس موجود ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مجھے اس وقت اپنے عقاید اور مسائل پر گفتگو کی ضرورت نہیں، البتہ غلط یا صحیح جن حلقوں کی طرف سے یہ عقاید پھیلائے گئے تھے اب وہ بھی ان کی اشاعت سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ اپنے اکابر کی غلط بیانیوں سے برأت کے بعد انہوں نے اب حنفیت کی ایک نئی دنیا آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تو اس حنفیت سے بے خبر تھے یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات دنیوی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختارِ کل، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب وغیرہ۔ آج سے چند سال قبل کے احناف کرامؒ بھی ان مسائل سے ناآشنا تھے۔

عملی فروع جن عملی فروع کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی عقاید سے مختلف نہیں ان میں بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کی وجہ سے تکفیر کی ذمہ داری برداشت کر لی جائے بلکہ عموماً فقہاء میں یہ فروع مشہور ہیں۔ اور مختلف مکاتب فکر ان پر عمل کرتے ہیں سو ان کے اسلام اور اہلِ سنت ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بریلوی حضرات معلوم ہوتا ہے، مولوی وصی احمد بریلوی ہیں اور یہ فتوٰی بھی بریلوی حضرات کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ معلوم ہے کہ اس میں امکانِ کذب باری کو سب سے پہلے کہا گیا ہے۔ یہ مسئلہ حضرات دیوبند کا امتیازی مسئلہ ہے۔ اہلِ حدیث میں سے بعض حضرات کا رجحان بھی اس طرف ہے لیکن ہمارے ہاں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ نہ سنت اور بدعت میں یہ مسئلہ کوئی امتیازی حیثیت ہی رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں صرف اس قدر کافی ہے کہ ذاتِ حق سے کبھی کذب اور ظلم کا ظہور نہیں ہوگا۔ اور بس۔ جل جلالہٗ و عم نوالہٗ

جامع الشواہد مکہ معظمہ میں قریباً ۱۳۰۰ھ میں حضرت شیخ العرب والعجم سید نذیر حسین صاحب

حج کے لیے تشریف لے گئے وہاں انہیں گرفتار کرانے بلکہ قتل یا قید کرانے کی سر توڑ کوشش کی گئی۔ اس حادثہ کا مفصل ذکر "اشاعۃ السنۃ النبویۃ" نمبر ۱۔ ۱۱ بابت ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ و محرم ۱۳۰۱ھ میں فرمایا گیا ہے اور اس وقت کے ہندوستانی اخبارات "مشیرِ قیصر" اور "وطن" وغیرہ میں یہ تذکرہ پوری تفصیل سے آیا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ بیت اللہ میں ترکی مندوب کے سامنے جب سید نذیر حسینؒ صاحب کو پیش کیا گیا — تو جامع الشواھد کو حضرت کی تصنیف ظاہر فرمایا گیا تاکہ اس کے مندرجات کو اہلِ حدیث کے عقاید سمجھا جائے — ترکی مندوب بچارا اردو زبان سے نابلد تھا۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا گیا کہ یہ میاں صاحب کی تصنیف نہیں۔ میاں صاحب نے اپنا عقیدہ بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا۔ انہوں نے فرمایا ہم ائمہ اربعہ کو اپنا مقتدا سمجھتے ہیں۔ ان کی تنقیص اور بے ادبی کو گناہ سمجھتے ہیں اور یہ عقاید ہمارے نہیں جن کا ذکر جامع الشواہد میں کیا گیا ہے۔ تب ترکی مندوب نے معافی چاہی اور میاں صاحب کو باعزت بری کیا اور دعا کی درخواست کی۔

پھر مزید تعجب یہ ہے کہ یہاں ہر کوشش کرنے والے چار بزرگ مولانا خیرالدین (مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کے والد) مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اور مولانا حاجی امداد اللہ صاحب دیوبندی ہیں۔

پہلے دونوں بزرگ بریلوی تھے اور ایسے سخت بریلوی کہ ان کی نگاہ میں مولوی احمد رضا خاں کا عقیدہ بھی درست نہ تھا بلکہ اس میں بھی کچھ وہابیت کی رمق تھی — (مولانا آزاد کی کہانی ان کی زبانی) اس لیے ان پر ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی افسوس نہیں۔ ان کی شان ہمیشہ یہ رہی ہے : لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً — وہ اہلِ توحید کی اذیت میں تمام اخلاقی حدود کو پھاند جاتے ہیں اور انہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ غلط بیانی جرم ہے یا نہیں۔

مولانا رحمت اللہ مغفور و مرحوم مشہور مسیحی مناظر ہیں انکی تصانیف ازالۃ الشکوک وغیرہ عیسائیت کے متعلق کامیاب اور مفید ہیں۔ انگریزوں کے خلاف انہوں نے مجاہدانہ کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان میں انگریز کے قدم مضبوط ہو گئے تو مولانا ہجرت فرما کر حجاز میں آباد ہو گئے۔ دیوبندی حلقوں میں مولانا بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر صوفی منش بزرگ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ طریقت ہیں۔ تصوف اور ارادت کے متعلق

ان کی بڑی پاکیزہ شہرت ہے۔

لیکن حیرانی ہے کہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب ایسے مرنجاں مرنج اور علوم وحدیث کے بے نظیر خادم سفرِ حج میں ان بزرگوں کی ایذا سے نہ بچ سکے۔

خدا و ندا یہ تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں

مولانا محمد حسین صاحب مرحوم بٹالوی نے "اشاعۃ السنۃ" (جلد ۶ ص ۱۰ و ۱۱) میں میاں صاحب مرحوم کے مصائب ۔۔۔۔۔۔ اور ان کے خلاف مساعی اور میاں صاحب کی راست گوئی اور استقلال کے متعلق تفصیلی واقعات سپردِ قلم فرماتے ہیں اور ان رجال کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے جو میاں صاحب کے مصائب اور آلام کا باعث بنے ـــــ مذہبی عصبیت اتنے بڑے اکابر کو انتہائی کج روی پہ آمادہ کرسکتی ہے۔ انسان تعصب میں وہ کچھ کر گزرتا ہے جس پہ کسی وقت اسے خود بھی ندامت ہوتی ہے ـــــ مدعی مدعیٰ علیہ دونوں اس عدالت میں پہنچ چکے ہیں جہاں کوئی چیز چھپ نہیں سکتی وہاں دودھ اور پانی بھی آمیز نہیں ہوسکتے اس لیے ان اکابرِ ملت کے متعلق دعائے مغفرت کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ اللھم اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان و لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا

لیکن عقل حیران ہے اور زبان گنگ اور ناطقہ سر بگریبان ہے کہ یہ کیا ہوا اور کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ ایسے اتقیاء کو یہ جرأت کیوں کر ہوئی؟ میاں صاحب عالم ہیں۔ فنِ حدیث میں ان کی مہارت مسلّم ہے۔ ان کی شرافت، تقویٰ، دقتِ نظر اور ذکاء علمی حلقوں میں حدیثِ محفل ہے۔ ملک میں ان کی آبرو ہے۔ خدمتِ حدیث میں عرب وعجم پر ان کا احسان معلوم، پھر وہ مسافر ہیں، ہم وطن ہیں ایک فریضۂ شرعیہ کی ادائگی کے لیے انہیں اس سفر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہ ہر لحاظ سے مواسات کے مستحق تھے۔

مولانا محمد حسین صاحب مرحوم اسے مذہبی اور سیاسی اختلافات پہ محمول فرماتے ہیں مولانا کے خیالات میں اس وقت خود بھی انفرادی رنگ ہے جس سے جماعت نہ اس وقت متفق تھی نہ آج ہے۔ ان خیالات سے اتفاق ممکن نہیں لیکن ان اختلافات کے باوجود ان حوادث کے لیے وجہ جواز سمجھ میں نہیں آئی جو وہاں میاں صاحب کو پیش آئے۔ اختلافات درست بھی ہوسکتے ہیں غلط بھی لیکن اس کے انتقام میں موت تک کی بازی لگا دینا کسی دانش مند آدمی کے لیے مناسب نہیں۔

پھر جامع الشواھد کو میاں صاحب کی تصنیف ظاہر کرنا ان اکابر کے لیے کیونکر موزوں ہوسکتا تھا ـــــ؟

لدھیانہ کے اکابر جامع الشواہد بریلوی حضرات کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اسی انداز کی ایک کتاب

دیوبندی حضرات کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا ”انتظام المساجد باخراج اہل الفتن و المفاسد“ یہ لدھیانہ سے شائع ہوئی لدھیانہ میں ایک بزرگ مولانا عبدالقادرؒ تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ مولانا عبداللہؒ، مولانا عبدالعزیزؒ، مولانا محمدؒ، مولانا محمد سیف اللہؒ صاحب ــــ اس خاندان کا رجحان عقیدہ دیوبندی مکتبِ فکر کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی حقیقت برزخ کی ہے وہ بریلوی اور دیوبندی دونوں حضرات سے ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں۔ اہلِ حدیث کی مخالفت میں دیوبند اور بریلوی مکاتب کو ملانے میں ان حضرات نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ سارے بھائی عالم ہونے کے ساتھ بے حد ہوشیار ہیں۔ ان حضرات کی اس وقت ایسی پوزیشن ہے کہ دیوبندی اور بریلوی دونوں ان کی عزت کرتے ہیں اور انہیں خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے مراسم بھی ان دونوں مکاتب سے ہیں۔ انتظام المساجد میری نظر سے نہیں گزری لیکن اس کے اقتباسات مولانا بٹالویؒ نے ”اشاعۃ السنۃ“ میں دیئے ہیں اور مولانا بٹالوی ہی کی معرفت ان حضرات سے تعارف ہوا۔ مولانا محمد حسین بٹالویؒ ایک دفعہ بٹالہ گئے انہوں نے کسی مسجد میں نماز ادا فرمائی ان حضرات نے مسجد دھونے کا حکم دیا اور مسجد دھو ڈالی گئی۔

انتظام المساجد کے اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اہلِ حدیث کے خلاف بہت پیش پیش تھے۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی فرماتے ہیں۔

”ازاں جملہ لدھیانے والے مولویوں نے تو اہلِ حدیث کی نسبت واجب القتل کا فتویٰ دیا ہے۔ چنانچہ انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد میں لکھ دیا ہے کہ ”حکام اہلِ اسلام کو لازم ہے کہ ان کو قتل کریں اگر وہ لاعلمی کے عذر سے توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول نہ کریں۔“ (اشاعۃ السنۃ نمبر ۱۰ جلد ۶ ص ۲۹۱ بابت ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ و محرم ۱۳۰۱ھ مطابق اکتوبر و نومبر ۱۸۸۳ء)

اس مسئلہ میں دیوبندی اور بریلوی حضرات میں مسابقت کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرات اہلحدیث کے خلاف ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مشقِ ستم فرماتے رہے۔ مولانا بٹالوی نے اشاعۃ السنۃ کے اسی پرچہ میں ایک اور رسالہ کا حوالہ دیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ”جس قدر شمشیر بدست، زبان کے ذریعہ سے ان (اہلِ حدیث) کا مقابلہ کیا جائے تھوڑا ہے۔“

اسی رسالہ کے ص ۲۹ میں مرقوم ہے کہ

”تھوڑا عرصہ ہوا کہ مکہ میں بعض لوگ بارادہ حج پہنچے تو اس (مولوی رحمت اللہ صاحب) کی زبان سے یہ بات سن آئے ہیں کہ اگر مولوی سید نذیر حسین ایک دفعہ یہاں (مکہ) آجائے تو پھر جان سلامت نہ لے جائے۔ یہ بات مجھے ایسے شخص سے پہنچی ہے جس کو مادرزاد ولی کہہ سکتا ہوں ــــ اور ہیں (مولانا محمد حسین بٹالوی)

خود بھی جب کہ مکہ میں مقیم تھا مولوی رحمت اللہ کی زبان سے مولانا ممدوح (سید نذیر حسین صاحب) کے حق میں مغلظ دشنام سن چکا ہوں اسی دن سے میں نے مکہ سے کوچ کرنے کا قصد کیا ورنہ میں حج کے بعد سال بھر کا ارادہ قیام رکھتا تھا جس سے صرف چار پانچ مہینے کا عرصہ گزرا تھا۔"

ان گزارشات سے مقصد یہ نہیں کہ مولانا بٹالوی کی اطلاعات قطعاً درست ہیں یا وہ مبالغہ سے خالی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جماعت کے اکابر کو کن مشکلات کا سامنا ہوا۔ میاں صاحب اس میں شک نہیں چند دن بیت اللہ میں محبوس رہے۔ ان سے بعض عقاید اور فروع کے متعلق سوال کیا گیا اس کی تصدیق اس وقت کے اخبارات سے ہوتی ہے "پیسہ اخبار"۔ "وطن"۔ اخبار "مشیر قیصر"۔ "کشف الاخبار"، "اکمل الاخبار"۔ "مظہر العجائب" مدراس۔ "کارنامہ" لکھنؤ۔ "جام جہاں نما" کلکتہ۔ "نیمروز" بجنور۔ "علین الاخبار" مراد آباد۔ "ہزار داستان" حیدر آباد۔ "دار السلطنت" کلکتہ۔ "طوطی ہند" میرٹھ۔ "کوہ نور" لاہور۔ "خیر خواہ اسلام" حیدر آباد۔ وغیرہ اخبارات میں یہ حالات شائع ہوئے۔ میاں صاحب کا ایک جعلی توبہ نامہ بھی شائع کیا گیا۔ موافقین اور مخالفین کے نام کچھ اس وقت اخبارات میں آئے۔ اخبارات نے اپنی آراء اس کے متعلق لکھیں۔ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ نے اپنے والد مرحوم کی ان ناپسندیدہ مساعی کا تذکرہ اپنی سوانح میں اکثر فرمایا اس سے بالکل ظاہر ہے کہ دیوبند کے اہل توحید اور بریلی کے ارباب دانش نے اس میں حصہ لیا۔ اور پھر حکومت انگریزی کی عقابی نگاہیں اس کے علاوہ تھیں۔ انبالہ کیس پٹنہ میں اہل توحید کی بربادی مولانا احمد اللہ اور مولانا جعفر تھانیسری کے مصائب سے جو جائزہ لیا جا سکتا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں۔

اس کے باوجود یہ تحریک اور یہ مسلک بچ نکلا سینکڑوں سے ہزاروں، ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچا اور اب کروڑوں تک پہنچ رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور ان بزرگوں کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے آج ہم بحمد اللہ کافی حد تک مطمئن ہیں۔ دل کا حال تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے بظاہر تعصب کی وہ صورتیں نہیں رہیں جو اس وقت تھیں۔

اب اس تشویش کے سوا جو کبھی کبھی ہوتی ہے اور اہل حدیث جماعت میں خلفشار کی کوشش کرتے رہتے ہیں جماعت کے سامنے کوئی خطرہ نہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ میاں صاحب مرحوم اور ان کے تلامذہ کی قربانیوں، نواب صدیق حسن خاں صاحب اور ان کی تصانیف کے ثمرات ہیں حضرت عبد اللہ غزنوی اور ان کے ابنائے کرام کے تقویٰ کے اثرات ہیں۔ مولانا ابو الوفا ثناء اللہ مرحوم اور مولانا

محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم اور ان کی ہوشمندیوں کا اثر ہے کہ اکثر رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں۔ والحمد للہ علی ذلک
اب ہمارے نوجوان طلباء کا کام ہے کہ ان اندرونی خطرات اور شورش پسندیوں کی طبیعت کو سمجھیں۔
اور معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ سوچیں کہ طوطی کہاں بولتے ہیں، کہاں داغتے ہیں، کہاں مارتے ہیں۔

اللھم احفظنا بفضلک من فتن الدنیا وعذاب الآخرۃ۔

نصرۃ الابرار | لدھیانوی خاندان کی دانش مندی اور وقت شناسی کا ایک اور واقعہ سن لیجیے۔

جن ایام میں اہل حدیث اور اس مسلک کے اکابر سے ان حضرات کی ٹھن رہی تھی ان دنوں سید احمد خاں مرحوم علی گڑھی نے ایک الیسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جس میں راجہ صاحب بنارس بھی شامل تھے۔ سرسید کا مقصد کانگریس کی مخالفت تھی اور کانگریس کا مقصد ہندو قومیت کی حفاظت تھی اور عام ملکی معاملات میں ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دونوں میں تھی۔ لیکن اس وقت یہ دونوں جماعتیں آزادی کی خواہش مند نہیں تھیں اور نہ انگریز کو ہندوستان سے نکالنا ان کے مقاصد میں شامل تھا۔ اس وقت دونوں کا مقصد انگریزوں سے مانگنا تھا کانگریس ہوشیاری اور چالاکی سے مانگتی تھی۔ سرسید منت اور لجاجت سے۔ ہمارے لدھیانوی بزرگ کانگریس کی راہ کو پسند فرماتے تھے اور غالباً کانگریس میں شامل تھے۔

سرسید احمد خاں بالمقابل نے ایک طرف راجہ بنارس کو اپنی جماعت میں شامل کیا دوسری طرف کانگریس کے بارے میں کہا کہ یہ ہندو جماعت ہے۔ کانگریس نے لدھیانوی برادران کو اس محاذ پر کھڑا کیا تاکہ یہ سرسید کی اسلام نوازی کو ننگا کریں۔ اور علماء سے فتویٰ حاصل کریں کہ کانگریس میں شمولیت مستحسن ہے اور سرسید کی جماعت میں شمولیت گناہ ہے۔ الیسوسی ایشن دراصل اسلامی جماعت نہیں بلکہ یہ سرسید کے سیاسی اور مذہبی نظریات کی ترجمان تھی۔ لدھیانوی برادران نے یہ فریضہ...... بڑی دانش مندی سے ادا کیا اور ایک فتویٰ "نصرۃ الابرار" کے نام سے شائع کیا خوبی یہ ہے کہ ان حضرات کا رجحان لظاہر دیوبندی افکار کی طرف تھا لیکن اس فتویٰ پر بریلوی حضرات کے دستخط موجود ہیں۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب نے کانگریس میں شمولیت اور سرسید سے الگ رہنے کے متعلق بڑا مفصل فتویٰ لکھا ہے۔ پھر اس فتویٰ کی اشاعت مولوی خیر شاہ صاحب نے کی ہے جو کٹر قسم کے بدعتی تھے انہوں نے مولانا عبداللہ صاحب مرحوم اور ان کے خاندان کی بڑی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے ——— مولوی احمد رضا خاں صاحب کا تشدد اور تصلب اہل توحید کے خلاف معلوم ہے۔ ان سے دیوبندی تحریر کی تصدیق اور پھر کانگریس میں شمولیت اور پھر اس کی اشاعت ایک بریلوی کی طرف سے یہ سب کچھ ہو گیا اور ان حضرات کی دیوبندیت پر کوئی اثر نہ پڑا اور اس وقت کے اکابر دیوبند نے یہ سب کچھ دیکھا انہیں ان حضرات کے متعلق کوئی شبہ نہ ہوا۔ سانپ مر گیا لاٹھی پر کوئی آنچ نہ آئی۔ یہ انتہائی دانشمندی

ہے یہ سب کام نصرت الابرار سے لیا گیا۔

اصل فتوای یہ فتوٰی مولانا عبدالعزیز مرحوم بن مولوی عبدالقادر مرحوم لدھیانوی کی ایک تقریر ہے جسے ان کے بڑے بھائی مولوی محمد مرحوم نے مرتب فرمایا اور مولوی بخیر شاہ امرتسری نے اسے شائع کیا۔ اصل فتوٰی ملاحظہ فرمایئے۔

سوال: سید احمد نیچری نے جو ایک جماعت السوسی ایشن قائم کی اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۹ اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس کے مخالف ہیں شامل ہیں۔ ہر شخص جو داخل ہو پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علی گڑھ میں یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے۔ اس کی مدد کے واسطے جابجا السوسی ایشنیں انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں۔ جو شخص ان سے اختلاف کرنے سے بر خلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ بپا کر کے جبراً ملانا چاہتے ہیں۔ آیا ایسی جماعتوں میں مسلمانوں کو شامل ہونا اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں؟

جواب: اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا۔

اس شخص کی اعانت کرنی اور اس سے علاقہ اور رابطہ قائم کرنا ہرگز درست نہیں۔ اصل میں یہ شخص شاگرد مولوی نذیر حسین وہابی بنگالی دہلوی غیر مقلد کا ہے اور بنیاد اس فرقہ کی عبدالوہاب نجدی سے شروع ہوئی ہے۔ (نصرت الابرار ص ۱۵)

پھر فرماتے ہیں۔

اب تک یہ حال ہے کہ جس شخص میں کوئی علامت وہابیت کی حکام حرمین شریفین پاتے ہیں فوراً اس کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ مولوی نذیر حسین مذکور جب حج کو گئے اسی وجہ سے حکام حرمین نے ان کو قید کر دیا۔ آخر ش بہزار منت و معذرت تائب ہو کر رہا ہوئے۔ چونکہ اس ملک کے وہابی یعنی جو غیر مقلد اور کبھی موحد اور گاہے محمدی اور اہل حدیث کے نام سے اپنے آپ کو یاد کرتے ہیں۔ مولوی نذیر حسین کے مقلد اور تابعدار ہیں بس ان کو نیچری سے جو ہم سبق ان کا ہے، ضرور بالضرور مدد کرنی چاہیے۔ (ص ۱۵ نصرۃ الابرار)

وانشمندی ملاحظہ فرمائیں بریلوی حضرات سے فتوٰی لینے کے لیے سر سید کو مولانا سید نذیر حسین صاحب کا شاگرد بنا دیا گیا ہے۔ میاں صاحب کے تلامذہ کی فہرست میں ہم نے سید احمد خاں کا نام نہیں دیکھا پھر میاں صاحب اور ان کے تلامذہ اور اہل توحید کا تعلق عبدالوہاب سے جوڑا ہے۔ پھر عبدالوہاب کو وہابیت کا بانی بتایا (حالانکہ نجدی تحریک کے بانی عبدالوہاب کے بیٹے محمد ہیں۔ بچارا عبدالوہاب تو

رسمی عالم تھا۔ کبھی غیر مقلد بنایا کبھی مولوی نذیر حسین صاحب کا مقلد ظاہر کیا۔

آپ فرمائیں گے کہ یہ سب شاید انگریز کی مخالفت کے لیے کیا گیا ہو تو ممکن ہے اس وقت مولانا سید نذیر حسین صاحب اور جماعتِ اہلِ حدیث نے انگریز کی حمایت کی ہو اور حضرات علماءِ لدھیانہ اس وجہ سے برافروختہ ہو گئے ہوں چنانچہ دو تین سال ہوئے لاہور کے ایک اخبار میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی ایک چٹھی شائع ہوئی۔ مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ ان ایام میں جماعتِ اہلِ حدیث نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا تھا ــــ میرا تعلق ابتداء ہی سے اہلِ حدیث حلقوں سے رہا ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ انفرادی طور پر کسی شخص کو غلطی لگی ہو تو ممکن ہے بحیثیتِ جماعت اہلِ حدیث نے کبھی انگریز کا ساتھ نہیں دیا لیکن مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی شہادت میرے لیے نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی۔ مجھے اپنی معلومات کے متعلق بے حد تشویش ہوئی۔ میں نے اس وقت اپنی معلومات کی بنا پر اہلِ حدیث کا مؤقف بذریعہ "الاعتصام" ظاہر کیا تاکہ جماعتِ اہلِ حدیث کے متعلق غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اسی اثناء میں پشاور سے واپسی پر مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی کی معیت میں راولپنڈی تک آنے کا موقعہ ملا۔ مولانا نے اس فتویٰ کے متعلق کچھ کوائف ذکر فرمائے۔ غالباً نصرت الابرار کا ذکر بھی ان کی زبان سے سنا۔ محترم مفتی صاحب ان کے عزیز برادرم ضیاء الحسن صاحب سے یہ بھی دریافت کیا مگر نصرت الابرار نہ ملی۔ بڑی مشکل سے حال ہی میں مجھے یہ کتاب دستیاب ہوئی اور مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ اہلِ حدیث کا دامن بحمد اللہ انگریز پرستی سے پاک ہے۔ ہو سکتا ہے وقت کے لحاظ سے اس وقت بعض حضرات سے انفراداً کوئی کمزوری یا لغزش ہوئی ہو لیکن ان کے مخالفین تو وقتی مصلحت کے حمام میں ان سے کہیں زیادہ ننگے ہیں۔ لیکن اہلِ حدیث کے متعلق پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بحیثیتِ جماعت اور ان کی اکثریت انگریز کے خلاف رہی ــــ چنانچہ اسی نصرت الابرار میں ان لدھیانوی اکابر کا ایک فتویٰ درج ہے۔ فرماتے ہیں۔

لدھیانوی فتویٰ

سوال: سلطنتِ انگلشیہ میں ہم کو اپنے امورِ دینیہ پر عمل کرنے سے روک نہیں، بہتر ہے یا حکومتِ روس جو سخت متعصب اور دشمن قدیمی سلطانِ روم کی ہے۔

جواب: اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا۔ سلطنتِ انگلشیہ بہتر ہے، کیونکہ سرکار دولت مدار مثل روس کے متعصب نہیں۔ اور سلطانِ روم (جو ایک بڑا بادشاہ ذی اقتدار اہلِ اسلام، خادم حرمین شریفین اور حافظ بیت المقدس وکرہ بلا معنٰی ہے) اور سرکار دولت مدار میں برخلاف روس کے اتحاد چلا آتا ہے۔ اگر بالفرض والتقدیر یہ سرکاری عملداری مملکت روس وغیرہ سے بہتر نہ سمجھی جائے تب بھی رعایا

اہلِ اسلام کو شرعاً حرام ہے کہ سرکار کے خلاف روس یا سلطانِ روم وغیرہ سے درپردہ رابطہ واتحاد پیدا کرے اھ (نصرت الابرار ص۹)

ہمارے بزرگوں سے مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی انگریز کی حمایت کے لیے بدنام تھے۔ اگر وہ یہ فتویٰ ملاحظہ فرماتے تو ادب سے عرض کرتے ؎

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا میرے حق میں زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہِ کنعاں کا

مولانا بٹالوی نے "اشاعۃ السنۃ" ص۱۰:۱ میں بالکل یہی کچھ فرمایا ہے جو اس فتویٰ میں مرقوم ہے اس لیے رقابت کا اصل سبب انگریز دوستی یا کانگریس سے تعلق نہیں۔ اصل سبب مقارنتِ زمانی ہے۔ تقلید اور ترکِ تقلید کا ذہنی تصادم اور پرانی عادات سے وابستگی۔ معلوم ہے سرسید کے خلاف سب سے زیادہ اور تحقیقی طور پر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے لکھا۔ اہلِ حدیث نے کبھی سرسید سے تعلق نہیں رکھا۔ نہ کبھی بلحاظ جماعت اس کی ایسوسی ایشن میں شامل ہوئے بلکہ سرسید کے اکثر رفقاء حنفی العقیدہ تھے۔ وہ خود بھی عملاً حنفی تھے جیسے زمخشری۔ میاں صاحب مرحوم کا فتاویٰ چھپ چکا ہے۔ وہ ہندوستان کو دار الاسلام نہیں فرماتے لیکن نصرت الابرار میں مولانا احمد رضا خاں صاحب نے صراحۃً فتویٰ دیا کہ ہندوستان انگریزی حکومت کے وقت دار الاسلام ہے۔ (ص۲۹)

مولوی احمد رضا صاحب نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام ہے اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام۔ اگر یہ سیاسی اختلاف اہلِ حدیث سے منافشت کا سبب ہوتا تو مولوی احمد رضا سے صلح کیسے ہو تی اور یہ حضرات خود بھی انگریزی حکومت سے لڑنا ناجائز سمجھتے تھے۔ اہلِ حدیث نے تو بحمد اللہ اس وقت بھی یہ جرم نہیں کیا بلکہ بحیثیت جماعت ان کا تعلق سید شہیدؒ کی جماعت سے رہا۔ اور یہ تعلق حال کے جنگِ کشمیر تک بدستور رہا۔ اکابر جماعت مولانا محمد حسین صاحب کے خلاف انگریز کی مخالفت کرتے رہے۔ مولانا حافظ عبد اللہ غازی پوری، مولانا عبد العزیز رحیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم آروی وغیرہم مولانا محمد حسین صاحب کی رائے سے کھلی مخالفت کرتے رہے۔

ایک ضروری یادداشت "نصرت الابرار" کے تین ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن کافی ضخیم کئی سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں تمام فتوے مفصل درج تھے۔ یہ ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا۔ دوسرا متوسط ایڈیشن جس میں مولوی محمد صاحب لدھیانوی مغفور اور مولوی احمد رضا خاں صاحب کے فتوے مفصل ہیں، باقی مختصر۔ یہ ایڈیشن میرے پاس موجود ہے جس کی روشنی میں زیرِ قلم گزارشات پیشِ خدمت کر رہا ہوں۔

تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں ملک بھی تقسیم ہوگیا اور لدھیانوی خاندان بھی تقسیم ہوگیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم اور ان کی اولاد ہندوستان چلی گئی۔ مفتی محمد نعیم صاحب اور ان کے عائلہ پاکستان تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ میں میونسپل کمشنر ہوگئے اور منڈی بہاؤالدین میں بڑی جامع مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ ان کے لڑکے مولانا ضیاء الحسن منٹگمری میں اقامت فرما ہیں اور کچھ خاندان گوجرانوالہ میں مقیم ہے۔

جو حضرات ہندوستان چلے گئے تھے انھوں نے حکومتِ ہند پر اپنی اہمیت جتانے اور اپنی پرانی خدمات کے صلہ کے لیے نفحت الابرار کا ایک نہایت مختصر ایڈیشن شائع فرمایا جس میں انگریز کی انصاف پسندی اور مذہبی آزادی اس کے ساتھ جنگ کی حرمت کا حصہ اور سرسید اور میاں صاحب مرحوم کی شاگردی نیز میاں صاحب کی حجاز میں گرفتاری کا حصہ نکال دیا۔ غالباً مولوی احمد رضا صاحب کا مفصل فتویٰ بھی حذف کر دیا ہے۔ ہوش مندی سے صرف اتنا حصہ شائع فرمایا ہے جو حکومتِ ہند کو اپیل کر سکے۔ دونوں جگہ آبرومندی سے گزر کرنا یہ اس خاندان کی ہوش مندانہ روایات کا حصہ ہے، سچ ہے ؎ یک من علم را دہ من عقل باید۔

پھر اس عالمانہ دانش وری پر غور فرمایئے۔ ہندو انگریز سے ہاتھ جوڑ کر مانگے اور اس مانگنے میں بقدر ضرورت کچھ حضرات علماء کو بھی شامل کرے تو بارگاہِ علم و دانش سے اسے ابرار کا نام عطا فرمایا جائے۔ ایک شخص مروجہ تقلید کی پابندیوں سے آزاد ہو کر براہِ راست کتاب و سنت کی طرف سلف کے طریقہ پر دعوت دے اور اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اپنی الگ تنظیم بنائے جیسے سرحد میں مجاہدین نے بنائی اور انگریز کی مخالفت میں جان تک دے دی اور اقامتِ دین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تو اسے مفسد اور فتنہ انگیز قرار دیا جائے۔ جو کتاب اس وقت کی کانگریس کے ساتھ اشتراک کے لیے لکھی گئی اس کا نام نصرت الابرار رکھا گیا اور جو کتاب اہلِ حدیث متبعین سنت کو مساجد سے نکالنے کے لیے لکھی گئی اس کا نام "انتظام المساجد باخراج اہلِ الفتن والمفاسد" رکھا گیا۔ ہندو ابرار قرار پا گئے اور متبعین سنت فتنہ انگیز اور مفسد ٹھہرائے گئے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

یہ سارے واقعات سامنے آنے کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مغفور کے متعلق ذہن صاف ہو جانا چاہیے۔ خاندانی روایات انسان کے گوشت پوست اور خون میں پیوست ہوتی ہیں۔ ان رسمی بندشوں سے نکلنا آسان نہیں۔ ابوالکلام آزاد روز روز پیدا نہیں ہوتے جس نے خاندانی اغلال و سلاسل کو ہوش و حواس سنبھالتے ہی تار تار کر دیا اور اپنے لیے خود اپنی دنیا بسائی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر کروٹ کروٹ اپنی

رحمت فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور ہمیں بھی معاف فرمائے اور ہماری لغزشوں کو اپنی رحمت کے پانی سے دھو دے ۔

الیس رحمۃ ربی حین یقسمہا　　علی قدر العصیان فی القسم

اور ان حضرات کو بھی معاف فرمائے۔ یہ حضرات بھی ماحول، خاندان اور وقت کے تقاضوں سے مجبور رہتے

اِن حوادث کی روشنی میں مستقبل کا جائزہ اِن واقعات سے چند نتائج واضح ہوتے ہیں ۔

۱۔ مخالفین نے بے جگری سے مخالفت کی۔ غلط، صحیح، جھوٹ، سچ، مناسب اور نامناسب تک کی پرواہ نہیں کی ۔

۲۔ اپنے ذاتی اور مکتبی اختلافات کو نظر انداز کر کے اہلِ حدیث مکتبِ فکر کو ناپید کرنے کی کوشش کی گئی ۔

۳۔ مخالفت کا میدان اقطارِ ہند کے علاوہ حجاز تک وسیع ہو گیا۔ نجد کی حکومت بھی نادانستہ ایک فریق قرار پا چکی تھی ۔

۴۔ انگریزی عدالتیں بعض دوسری وجوہ کی بنا پر جماعت کو ختم کرنا پسند کرتی تھیں ۔

۵۔ اہلِ بدعت نے جہالت اور تعصب سے اور اہلِ توحید نے مستعار حیلوں سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ عفا اللہ عنہم ۔

۶۔ بریلی، بدایوں، لدھیانہ، دیوبند، سہارن پور، لکھنؤ، لاہور اور رنگون نے اپنی بساط کے مطابق اس کارِ خیر میں حصہ لیا ۔

۷۔ مخالفت اس قدر شدید تھی کہ قتل کے فتوے اور حبسِ دوام کی مساعی سے بھی گریز نہیں فرمایا گیا۔

اہلِ حدیث کی حالت ۱۔ جماعت کا سیاسی نظام بظاہر ۶ مئی ۱۸۳۱ء میں درہم برہم ہو گیا تھا۔ کمزور اور پوشیدہ طور پر ۱۹۲۱ء بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہا ۔

۲۔ البتہ تبلیغی کوششیں فقدانِ نظم کے باوجود اچھی حالت میں تھیں اور سب سے نمایاں یہ چیز تھی کہ ان کی بنیاد لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا پر تھی ۔

۳۔ علماء اور مبلغین میں انتہائی خلوص تھا۔ اور عوام میں تقویٰ اور رزقِ حلال کی پابندی بدرجۂ اتم تھی ۔

۴۔ اہلِ علم کا احترام اور اطاعت بقدر امکان موجود تھے۔

۵۔ قرآنِ عزیز اور دینی مدارس جابجا موجود تھے۔ دہلی مدرسہ کو حضرت میاں صاحب کی وجہ سے قدرتی اقتدار حاصل تھا۔

۶۔ اکثر اہلِ قلم اور اصحاب التدریس حضرت شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب سے مستفید تھے۔ میاں صاحب کا احترام باقاعدہ نظام کے بغیر قدرتی طور پر ذہنوں میں موجود تھا۔ مخالفین بھی میاں صاحب کے علم اور شرافت سے متاثر تھے۔

۷۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تصانیف اور سخاوت سے توحید و سنت کی اشاعت میں بے حد مدد ملی۔ اور یہ اثر بھوپال، بمبئی اور پشاور تک پہنچا۔

۸۔ مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کے بعض نظریات (جہاد کا مفہوم اور انگریز کے ساتھ تعاون) سے جماعت کو شدید اختلاف تھا۔ لیکن اس کے باوجود مخالفت کی نوبت نہیں آئی۔ مولانا بٹالوی اپنے طریق پر کام کرتے رہے۔ باقی علماء اپنی صوابدید کے مطابق۔

۹۔ میاں صاحب اور ان کے اکثر تلامذہ انتہائی مخلص تھے۔ مخالفین کی چالاکیوں کے باوجود کبھی بدزبانی اور برائی میں مماثلت کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ عام عمل فاصفح الصفح الجمیل پر ہی رہا۔

۱۰۔ ان مقدس بزرگوں میں بعض مبلغ اور مقرر تھے۔ بعض مدرس، بعض مصنف لیکن مشاہرات اور معاوضوں کے لیے طمع اور اشراف ان میں نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہے وزیر آباد میں حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ جیسے محدث تشریف لائے۔ تو حضرت میاں صاحب مرحوم کے مشورہ سے ان کی تنخواہ مبلغ ۱۰ روپے مقرر ہوئی۔ دو تین ماہ کے بعد جماعت اس کی بھی پابندی نہ کر سکی۔ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی کا اعزازیہ ۱۵ پندرہ روپے مقرر ہوا۔ (اشاعۃ السنۃ ۱۳۱۱ھ) مگر اس کی ادائیگی میں بھی باقاعدگی نہ رہ سکی۔ مولانا محمد صاحب لکھوی، مولانا ہدایت اللہ صاحب راولپنڈی، مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی مولانا عبدالاول صاحب، مولانا علاؤالدین صاحب نے پوری عمر جماعت پر کوئی لازمی بوجھ نہیں ڈالا۔ رحمہم اللہ۔

اس کے باوجود بڑی عزت سے وقت گزارتے تھے۔ مشاہرات کے لیے آج جس مسابقت کو شعار بنایا جا رہا ہے یہ اچھی فال نہیں۔ بظاہر یہ خلوص کے منافی ہے۔ علماء اور طلباء کو اگر مستقبل میں جماعت کی خدمت کرنا ہے تو توحید و سنت کی اشاعت اگر ان کا مقصدِ حیات ہے تو علم کی خدمت، مدارس کی تاسیس۔ اور اختلافات کی تشکیل کاروباری انداز سے نہیں ہونی چاہیے۔ اور نہ

نظریاتی اختلاف کو فرقہ اور پارٹی کا رنگ ہی دینا چاہیے۔ تعلیمی انتشار، چھوٹے چھوٹے دارالعلوم اور جوامع جماعت کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے۔ کوئی اجتماعی منصوبہ ہی جماعت کو کامیاب کر سکتا ہے۔

آج کے حالات مجھے معلوم ہے آج کے حالات ان حالات سے کافی مختلف ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا۔ آج کے حیرت انگیز قحط نے علماء اور عوام کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ عوام کی دینی علوم سے بے اعتنائی اہلِ علم کے متعلق بدگمانیوں نے نئی قسم کی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ علماء کی قلت نے انہیں ایک گرانمایہ جنس بنا دیا ہے اس کے باوجود اخلاص اور خودداری کی راہیں ریاء و سمعہ اور طمع ولالچ سے قطعی جدا ہیں۔ اگر اخلاص موجود ہو تو جہاں یہ مشکلات ہیں وہاں بیسیوں آسانیاں بھی اس وقت موجود ہیں جو پہلے موجود نہ تھیں۔ عام بصیرت، موجودہ تعلیم کی اشاعت اور علوم کی وجہ سے وہم پرستی، پیر پرستی اور قبر پرستی کے لیے زمین روز بروز تنگ ہو رہی ہے۔ علم و تحقیق کے شوق کی وجہ سے تقلید اور جمود کی وسعتیں محدود ہو رہی ہیں۔

کتابوں کی اشاعت بڑی کثرت سے ہو رہی ہے۔ پرانے علمی ذخائر، احادیث کی نایاب کتابیں جو لائبریریوں کے دور افتادہ گوشوں میں گم نامی کی نذر ہو رہی تھیں آج بازار کی زینت ہو رہی ہیں۔ شروح حدیث کا کامیاب ذخیرہ طبع ہو چکا ہے۔ اس لیے اگر مقصد کے ساتھ محبت ہو اور دل اخلاص کی نعمت کے ساتھ بھرپور ہو تو کامیابی کے امکانات بے حد روشن ہیں۔ اور اگر اہلِ علم ہی وقت کے تقاضوں سے اعراض فرمالیں تو علم و اعتقاد کی اس امانت کا خدا حافظ۔

ضرورت ہے تبلیغ و تدریس، تصنیف و تالیف کی طرف کچھ قدم اٹھیں اور پورے اخلاص سے اٹھیں، کامیابی ان کے استقبال کے لیے چشم براہ ہو گی۔ اور مشکلات قطعاً راستہ نہیں روک سکیں گی۔

نواب صدیق حسن خاں اپنے دور میں نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کا مقام منفرد ہے۔ ان کے قلم سے زیادہ تر ایجابی انداز کی چیزیں نکلیں اگر کبھی سلبی انداز کی کتاب نوکِ قلم تک آئی تو اس میں بھی اس قدر سنجیدگی غالب تھی کہ اس کی سلبی حیثیت نمایاں نہ ہو سکی۔ تفسیر فتح البیان، عون الباری، سراج الوہاج فتح العلام، مسک الختام، الروضۃ الندیۃ، ابجد العلوم، اتحاف النبلاء وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے بارِ احسان سے امت سبکدوش نہیں ہو سکے گی۔

اس دور کی خدمات پر تبصرہ طویل صحبت چاہتا ہے۔ میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو ممکن ہے اس دور کی خدمات پر بسط سے کچھ کہا جا سکے۔

اختلافات سے بچنے کی ضرورت آج اہلِ حدیث اور علماء دیوبند دونوں کا یہ حال ہے کہ جو جگہ

خالی ہوئی وہ پر نہیں ہو سکی۔ کام تو بہر حال چل ہی رہا ہے لیکن جو حضرات رخصت ہوئے ان کی جگہ ان کے کسی عدیل نے پر نہیں کی۔ مولانا عبد الحی لکھنوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حسین علی، وغیرہم۔ اسی طرح مولانا سید نذیر حسین صاحب، مولانا سید شریف حسین صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، شاہ عین الحق پھلواری، مولانا عبد الجبار غزنوی، حافظ محمد صاحب لکھوی، مولانا عبد الاول صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبد المنان صاحب وزیر آبادی، مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری، مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی، ان کی جگہیں خالی ہیں ان مقامات پہ جو لوگ کام کر رہے ہیں وہ کسی طرح بھی ان کے ہمسر نہیں۔

ضرورت ہے کہ ہونے والے نوجوان کتاب وسنت کی اشاعت کریں۔ اپنے مسلک کی خدمت کریں۔ یہ خدمت ایجابی ہو یا سلبی، تخریبی نہیں ہونی چاہیے۔ مسلکی اور فرعی اختلافات مجالس درس سے باہر نہ نکلنے پائیں —— یہ چرچے مجالس علم اور مصنفات تک محدود ہو جائیں —— ائمہ اربعہ کے مسالک میں علم وتحقیق کی بنا پہ اہل علم مسلک بدلتے رہے لیکن اس سے نہ رنجش پیدا ہوئی۔ نہ کفر و اسلام کے فتوے چلنے شروع ہوئے۔ اختلافات عوام تک پہنچائے جائیں تو اس سے مختلف خطرات ہو سکتے ہیں۔

اس وقت ذہین طلباء انگریزی مدارس میں جا رہے ہیں، کند ذہن اور کم فہم غیر مستطیع طلباء عموماً دینی مدارس میں آتے ہیں۔ کچھ دینی مدارس کا نظام مفت خوری پہ مبنی ہے اس سے بعض غلط اخلاقی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے مدارس میں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ کم علمی کی وجہ سے تعصب بڑھ رہا ہے۔ بسا اوقات معمولی اختلافات پہ اتنا زور دیا جاتا ہے جیسے کفر و اسلام میں تفاوت ہونا چاہیے۔ اگر مستقبل کی تعمیر مقصود ہے تو سر جوڑ کر ایک نظم کے تحت مل کر کام کرنے کی کوشش فرمائیے۔ خود سری اور انفرادیت موت کی نشانی ہے اور جماعت سے دشمنی کے مترادف۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان کی تشکیل ان ہی مقاصد کے لیے عمل میں آئی ہے۔ اب بحمد اللہ یہ نظام پھیل رہا ہے۔ جمعیۃ کی مختلف شاخیں سینکڑوں کی تعداد میں ملک کے طول و عرض میں پھیل رہی ہیں۔ اس نظام سے وابستہ ہو کر جماعت کی ہدایات کے ماتحت کام کریں۔ کتاب وسنت کی اشاعت کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق مرحمت فرمائے۔

جماعت کے سامنے مختلف پروگرام ہیں۔ ابتدا تعلیم سے کی گئی ہے۔ علماء روز بروز کم ہو رہے تھے۔ ائمہ حدیث کی حمایت اور مسلک کی اشاعت میں غیر معمولی انحطاط آ رہا تھا۔ اس لیے تعلیم کا سلسلہ جامعہ سلفیہ

کی تاسیس سے شروع ہوا۔

اس کے بعد ان شاء اللہ پریس کا مرحلہ پیش نظر ہے۔ کتابوں کی اشاعت اور شروح احادیث کی طباعت کے ساتھ ائمہ سلف کی مفید تصانیف کے تراجم غیر مطبوعہ ذخائر سنت کی اشاعت از بس ضروری ہے۔

اس معاملہ میں اہل علم سے زیادہ اہل ثروت اور جماعت کے دولت مند حضرات کی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں سہولت اسی وقت ہو سکتی ہے کہ پریس اپنا ہو۔ اور یہ ادارہ بالکل کاروباری لائنوں پر چلایا جائے تاکہ اپنے بوجھ کے ساتھ جامعہ کے مصارف کا بھی کسی قدر کفیل ہو سکے۔

مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے اعضاء اگر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اپنے ماحول میں دردمندی اور ذمہ داری سے کام کریں تو تمام مصارف آسانی سے برداشت کیے جا سکتے ہیں۔ اگر جماعت کی طرف سے یہ اعتماد اور اعزاز ہمیں احساس اور سعی عمل سے روشناس نہ کر سکے تو یہ بدنصیبی ہوگی اور مشکلات غیر مختتم ہوں گی۔

مجھے امید ہے کہ یہ طویل سمع خراشی احباب کے لیے محرک ثابت ہوگی۔ والسلام علی النبی واھلہ

الاعتصام: ۱۲/۴۸ - ۳۱ / جولائی ۱۹۵۹ء
الاعتصام: ۷ / ۱۴ - ۱ / اگست ۱۹۵۹ء

قابل ضبط کتابیں

بریلوی حضرات سے مؤدبانہ گزارش

دو عملی چھوڑ دیجیے کسی دیوبندی جریدہ کے مدیر نے "قہر القادر" نامی کتاب میں بدزبانی کی وجہ سے حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اسے ضبط کر لے۔ گوجرانوالہ کے ایک بریلوی جریدہ نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے مزید چند کتابوں کی ضبطی کے لیے حکومت سے استدعا کی ہے۔ یہ کتابیں بعض علماء دیوبند کی ہیں، بعض شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی، بعض سید احمد شہیدؒ کی اور بعض شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی۔

ہم نے قہر القادر دیکھی ہے نہ باقی کتب بالاستیعاب پڑھی ہیں البتہ حوالوں میں جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے وہ قرآن اور سنت کے بالکل موافق اور ائمہ سنت کے مسلمات میں سے ہیں۔ بریلوی مدیر نے حوالوں کا اختصار کرتے ہوئے انہیں غلط بیانی اور افتراء کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

بریلوی حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ وہ دو عملی چھوڑ دیں۔ اگر ان اعتقادات اور مسائل سے ان کو دکھ ہوتا ہے اور ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو ہمیں ان سے پوری ہمدردی ہے۔

لیکن صحیح راہ یہ ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی ضبطی کے لیے حکومت سے مطالبہ فرمائیں ۔ کتابیں بالفرض ضبط ہو گئیں لیکن قرآنِ عزیز ضبط نہ ہوا ۔ تو آپ کے جذبات بدستور مجروح ہوتے رہیں گے ۔ یہ دو عملی مناسب نہیں ۔ عوام سے ڈر کر آپ قرآنِ عزیز کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے اور ۔ جو کتابیں قرآنِ عزیز سے ماخوذ ہیں، ان کی ضبطی کے لیے آپ ہنگامہ بپا کر رہے ہیں ۔

اِس مطالبہ میں کوئی استواری نہیں ۔ دل کڑا کیجیے اور اصل مطالبہ پہ ڈٹ کر حکومت پہ زور دیجیے ۔ قدماءِ مکہ آپ سے زیادہ دانش مند اور معاملہ فہم تھے ۔ ان کا مطالبہ بے حد صاف اور جرأت مندانہ تھا ۔ یعنی :

اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۔ کوئی اور قرآن لاؤ یا اسے بدل دو ۔

اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے گھبرانا نہیں چاہیے ۔ اس لیے اصل مطالبہ سامنے آنے دیجیے ۔

بریلوی ذہن ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا اور مسرت ہوئی کہ بریلوی حضرات نے ایک معقول مطالبہ کو دل گو با دل ناخواستہ ہی سہی) قبول فرمالیا ورنہ جہاں تک ہمارا تجربہ ہے ہمارے بریلوی دوستوں کو معقول بات سننے کی بھی عادت نہیں کہنا تو بڑی بات ہے ۔ ان حضرات کے ذہن، علم اور عقل دونوں سے ناآشنا رہے ہیں ۔

بریلوی فرقہ کی عمر قادیانی حضرات سے زیادہ نہیں ۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۰ھ میں انتقال فرمایا ۔ اس فرقہ کا آغاز مولانا احمد رضا صاحب نے فرمایا ۔ مولانا کی تصانیف سے لے کر مولانا نعیم الدین، مولانا دلدار علی شاہ تک اکابر جماعت کی تصانیف پہ غور فرمائیے ۔ علم و دانش کے سوا وہاں آپ کو سب کچھ ملے گا ۔ ان حضرات کی تصنیفات سے طعن و تشنیع کو الگ کر دیا جائے تو ایک تہائی بھی باقی نہیں رہ جائے گی ۔

اس لیے ہم بریلوی جریدہ کے مدیرِ محترم کو مبارک باد عرض کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اکابر کی عادت کے خلاف "قہر القادر" کی ضبطی کی تجویز قبول فرمائی ۔

اعتقادات کا جائزہ اب ہم ان اعتقادات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے بریلوی حضرات کے دل مجروح ہو رہے ہیں ۔ اس کے ساتھ قرآنِ عزیز اور سنت سے ان نصوص کا مختصر تذکرہ بھی کریں گے جن سے ان عقائد کی تائید ہوتی ہے تاکہ ہمارے محترم مخاطب محسوس فرمائیں کہ ان کتابوں کی ضبطی سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوگا ۔

ان کے مجروح دلوں کو اسی صورت اطمینان نصیب ہو سکتا ہے کہ ـــ
قرآن عزیز کے تیس پارے ـــ اور سنن صحیحہ کے دفاتر ضبط ہوں۔
یا صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں۔

عقیدہ ۱۲ :۔ "تقویۃ الایمان" صد ۲۲ کی عبارت سے جو مطلب شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس میں جس طرح قطع و برید کی گئی ہے، اسلامی شرافت اور دیانت کے خلاف ہے۔
ـــ شاہ صاحبؒ کا فرمان یہ ہے کہ ـــ چابیاں جس کے پاس ہوں، خزانہ اسی کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ جب چاہے خزانہ صرف کر سکتا ہے۔ جب غیب کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں تو غیب کے خزانے بھی اسی کے قبضہ میں ہوں گے ـــ شاہ صاحبؒ کا منشاء یہ ہے کہ علوم غیبیہ کا استحضار اور ان پر کلی تصرف یہ اللہ کی مخصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ علوم نہ کسی کو عطا فرمائے ہیں نہ کسی کو بالذات حاصل ہیں۔ جزدی طور پر اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے جس کو چاہے عطا فرما دیتا ہے۔ اھ

میں مانتا ہوں کہ یہ عقیدہ آپ کو ناگوار اور ناپسند ہے اس لیے آپ کے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں۔
ـــ لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآنِ عزیز شاہ صاحبؒ کی پوری پوری تائید فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ۔ مفاتح اسم آلہ اور ظرف دونوں کی جمع ہے اس کا معنیٰ چابی اور خزانہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ یہ جمع کثرت کے اوزان سے ہے جس کا مدلول وہ کلی علوم ہیں جن کا احاطہ انسان کے لیے محال ہے۔ ارشادِ خداوندی کا منشاء یہ ہے کہ غیب کے خزانے اسی کے پاس ہیں اور ان کا علم صرف اسی کو ہے۔ استثناء نفی کے بعد آتا ہے جس کا مفاد حصر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ آیت کا عموم ذاتی اور عطائی دونوں کو شامل ہے ـــ اب تحریفِ معنوی کا ارتکاب وہ حضرات کریں گے جو عطائی کو مستثنیٰ کرنے کی کوشش کریں گے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔	آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں حساب کے لیے کب اٹھایا جائے گا۔

اس آیت میں الّا نفی کے بعد آیا ہے اس کا منطوق بھی حصر ہے یعنی اللہ کے لیے غیب کو ثابت فرمایا اور غیر سے نفی فرمائی۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ	ان سے کہہ دو میں اللہ کی مشیت کے بغیر کسی کو فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں غیب جانتا

مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ | تو میں کثرت سے خیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ میں اہلِ ایمان کے لیے صرف نذیر اور بشیر ہوں۔ اھ

بریلوی مدرسۂ فکر کے جذبات اس سے یقیناً مجروح ہو سکتے ہیں لیکن اس کی ذمہ داری شاہ شہیدؒ پر نہیں بلکہ رب العزت اور قرآنِ عزیز پر ہے۔ اس لیے بارگاہِ ایزدی میں عرض فرمایئے کہ ——— "اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا اَوْ بَدِّلْهُ ——— یہ قرآن بدل دو، ہمیں اس قرآن کی ضرورت نہیں یا کوئی اور قرآن لے آؤ۔

جب تک یہ مطالبہ منظور نہ کر لیا جائے کسی کتاب کی ضبطی مفید نہیں ہو گی۔

کتاب و سنت پر نظر رکھنے والے اور توحید کے عاشق کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے جس سے آپ کے جذبات مجروح ہوتے رہیں گے۔ آپ کی یہ تمام مساعی جذبۂ توحید کی سرمستیوں کو کم نہیں کر سکیں گی ؏

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اس لیے مناسب ہے، ساری بریلوی دنیا مل کر قرآنِ عزیز کا کوئی علاج کرے۔

——— ۲ ——— اسی میں ص۵۵ کے حوالہ سے آپ نے ذکر فرمایا ہے "اللہ کے مکر سے ڈرنا چاہیے"

آپ کو لفظ مکر کی اضافت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف کھٹک رہی ہے ——— یہ تکلیف آج سے چند سال قبل پنڈت دیانند کو بھی ہوئی تھی ——— (ستیارتھ پرکاش، ام اسلاس ص۴۹) لفظ مکر کی لغوی تشریح بھینس کے سامنے بین بجانے کے برابر ہے۔ آپ حضرات ادبی ذوق سے محروم ہیں۔ آپ کے ہاں غالباً وہ پردہ ہی نا پید ہے جس سے ادبی لطافت کا احساس ہوتا ہے لیکن قرآنِ عزیز کا کیا کیجیے گا وہ فرماتا ہے:۔

۱۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (۳ ـ ۵۴)	ان لوگوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا اور اللہ کا مکر بہترین رہا۔
۲۔ اِنَّهٗ لَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ (۷ ـ ۹۹)	خسارہ پانے والے ہی اللہ کے مکر سے بے خوف ہوتے ہیں۔
۳۔ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۷ ـ ۵۰)	ان لوگوں نے مکر کیا ہم نے مکر کیا لیکن وہ بے شعور تھے۔
۴۔ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا (۱۳ ـ ۴۲)	تمام تر مکر اللہ ہی کے لیے ہے۔

قرآنِ عزیز میں مکر کا جو بھی مفہوم لیں گے وہی وہابیوں اور دیوبندیوں کی طرف سے سمجھ لیجیے ——— اصل

عرض آپ کے لیے قرآن ہے، جیسے ہو سکے اسے ضبط کر لیجئے۔

۳ــــ ص۶ سے ص۹ تک آپ نے تقویۃ الایمان کے مختلف اقتباسات پر رنج کا اظہار فرمایا ہے آپ اپنی رائے میں مختار ہیں لیکن سچ عرض کر دوں، اگر خدا تعالیٰ سے تھوڑا بہت تعلق بھی باقی ہو ـــــ تو ان صفحات میں توحید کا ایک سمندر ہے ـــــ میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کی وجہ سے میں نے ان صفحات کو بار بار پڑھا۔ سبحان اللہ! کتنا مدلل اور کس قدر پر لطف کلام ہے۔ میرے جیسے خشک مزاج آدمی پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ نے یہاں بھی اختصار کو خیانت کی حد تک پہنچا دیا ہے ـــــ اگر آپ پورا کلام نقل فرما دیتے تو آپ کو اپنی رائے پر ندامت ہوتی۔ آپ نے جو ذلیل الفاظ شاہ شہیدؒ کے متعلق استعمال کیے ہیں، آپ کا ضمیر آپ کو ملامت کرتا اور آپ کے اتباع بھی غلطی سے بچ جاتے۔ آپ کا نظریہ پڑھ کر يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب خدا کا کلام بعض طبائع کے لیے گمراہی کا موجب ہو جاتا ہے تو شہیدؒ بچارا کون ہے؟

شہیدؒ کا مقصد یہ ہے کہ شرک صرف یہی نہیں کہ دو برابر کے خداؤں پر یقین رکھا جائے، بلکہ کسی انسان کو حاضر ناظر . . . . . عالم الغیب، متصرف جاننا حق تعالیٰ کی صفات خاصہ کسی دوسرے میں تصور کرنا، یہ خیال کرنا کہ کسی کی وجاہت یا محبت سے اللہ تعالیٰ متاثر ہوتا ہے اور اس سے سفارش قبول کرنا ضروری ہو جاتا ہے، یہ بھی شرک ہے۔ ذاتِ حق کی صفات خاصہ نہ کسی میں ذاتی طور پر پائی جاتی ہیں نہ عطا رو توہب سے ان میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک ہو سکتا ہے ـــــ الفاظ کی کھینچ تان سے تھوڑا ہٹ کر سوچیے اس سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

قدما ابن عرب کے عقاید کا قرآنِ حکیم نے جہاں تذکرہ فرمایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ بالاستقلال متعدد آلہوں کے قائل نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم، تصرف، الوہیت اور صفات میں وہ اپنے اولیاء کو خدا کا عطائی شریک سمجھتے تھے اور یہ سارے پاپڑ وہ اس لیے بیلتے تھے کہ اس سے ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور ان بزرگوں کی شفاعت سے ان کے مقاصد پورے ہوں ـــــ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى ـــــ (ہم ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں) هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ (اللہ کے پاس یہ ہمارے شفیع ہیں)

قرآنِ عزیز نے اس عذر کو قبول نہیں فرمایا بلکہ اس عقیدہ کو شرک ہی فرمایا اور انہیں ملامت کا مستحق سمجھا۔

آپ کی طرف سے اہلِ توحید پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ بتوں کی آیات کو انبیاء اور اولیاء اللہ پر

چسپاں کر دیتے ہیں (رضائے مصطفیٰ ص۲ کالم ۱)

اولاً تو گزارش ہے کہ کافر، مشرک یا اولیاء اللہ کسی کا نام نہیں یہ صفات ہیں جن کا فیصلہ عمل ہی سے ہوتا ہے۔

دوم آیات میں بتوں کی تصریح نہیں۔ آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ کوئی آیت بتوں کو دائیں اور کوئی ولیوں کو عنایت فرمائیں؟

سوم، الفاظ جب عام ہوں تو انہیں کسی دوسرے کے ساتھ خاص کر دینا، اس کا ٹھیکیدار آپ کو کس نے بنایا ہے؟

قرآن کا آپ کے پاس کیا علاج ہے وہ تقویۃ الایمان کے مصنف کی تائید فرماتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (توبہ)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور فقیروں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنایا اور حضرت مسیح کو۔ انہیں یہ حکم تھا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے۔

یہ مولوی، فقیر اور حضرت مسیح علیہ السلام بت تو نہیں تھے۔ یہ تو عالم، ولی اور نبی ہی تھے اور یہ ربوبیت اطاعت اور انقیادِ احکام اور حلال و حرام کے لحاظ سے تھی۔ یہاں تقلیدی جمود کو شرک فرمایا — جو آج کل زیادہ تر بریلوی فرقہ میں ہی پایا جاتا ہے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم)

آسمان اور زمین کے سب بزرگ اللہ کے سامنے غلام بن کر حاضر ہوں گے۔

کسی پڑھے لکھے آدمی سے دریافت فرمایئے۔ مَنْ اور مَا میں کیا فرق ہے؟

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ الخ

اللہ کے سوا ان چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان دے سکتی ہیں نہ فائدہ اور یہ انہیں اپنا سفارشی کہتے ہیں۔

یہاں معبودوں کو مَا سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا معبود بت ہو یا ولی، مولوی ہو یا پنجہ۔ جن ہو یا پری، بھوت ہو یا پریت، پیپل ہو یا کیکر، یہ عبادت شرک ہو گی۔ جو ایسا کرے مشرک اھ

اب قرآن تو تقویۃ الایمان کے مصنف کی تائید فرماتا ہے آپ کے دل مجروح ہوتے ہیں — تو استغفار تو قرآن کے خلاف ہونا چاہیے بیچارے شہید کو گالیاں دینے سے کیا فائدہ؟

لم ـــــ بت بھی تو اولیاء اللہ اور بزرگوں ہی کے تھے ۔ لات، منات، وسواع، یغوث، یعوق، نسر اپنے وقت میں بزرگانِ دین یا اولیاء اللہ ہی تو تھے (ترمذی، بخاری، ابنِ کثیر، خازن، ابنِ جریر، تفسیر عزیزی، مظہری وغیرہ)

یہ فلسفہ بیان فرما دیجیے، جب ولی کا بت بن جائے تو اس کی عبادت شرک بن جاتی ہے اور جب ولی کی قبر بن جائے تو شرک جائز ہو جاتا ہے ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ایسے اولوالعزم انبیاء جب ان کے بت بنا دیئے جائیں تو ان کی عبادت شرک ہو جائے اور قرآن مجید کی آیات کا انطباق ان پہ درست ہو جائے اور بیروح بے تصرف ہو کر رہ جائے ـــــ نہ لڑکا دے سکے نہ لڑکی، نہ روٹی دے نہ پانی ـــــ لیکن جب خواجہ ہجویریؒ اور خواجہ عطار پر قبہ بن جائے تو ان کو سجدہ زمین بوسی قرار پائے اور مرادیں دینے لگے ۔ ان کے پاس لڑکے لڑکیوں کا سٹاک سمجھا جائے اور ان کی روح مریدوں کے گھروں تک ان کا تعاقب کرتی پھرے اور بعض اوقات تو نیند تک حرام کر دے ۔

یہ تصرف روح میں ہے یا پتھر اور قبر میں ؟ اگر تصرف روح میں ہے تو بت اور قبر کا حکم یکساں ہونا چاہیئے یہ دونوں جگہ بے قرار رہے اور مریدوں کے ہاں گھر گھر پھرتی رہے اور قرآن کی ان آیات کے لیے جن میں شرک سے روکا گیا ہے کوئی اور محمل تلاش کر لیا جائے ۔

اگر روح کی قوت پتھر کی وجہ سے سلب ہو چکی ہے یا اس کے اختیارات واپس لے لیے گئے ہیں تو سنگ مرمر کی قبروں کا کیا حکم ہے ؟ ان ولیوں کی روح سے بھی کچھ بن آتا ہے یا نہیں ؟ یا قبر کے پتھر اور بت کے پتھر میں بھی کچھ فرق ہے ؟ کیا نبی یا ولی کا بت بن جانے کے بعد اس کی نبوت یا ولایت واپس لے لی جاتی ہے ؟ ۔

صاحبِ تقویۃ الایمان کی بات سمجھ میں آتی ہے ۔ وہ قبر اور بت دونوں کی عبادت کو شرک سمجھتے ہیں ۔ دونوں پہ نذر و نیاز چڑھانا حرام سمجھتے ہیں اور آیاتِ توحید اور نفی عن الشرک کو دونوں مقام پہ ناطق سمجھتے ہیں ۔ ـــــ آپ کے ہاں شرک کے معاملہ میں بتوں اور قبروں میں فرق ہے ـــــ اس کا معمہ حل فرمایئے ۔

بد لو دار غلط بیانی بریلوی مدیر نے شاہ شہید پر تہمت لگائی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر فرماتے ہوئے باقی "ایمانیات" سے روکا ہے ۔ یہ قطعی غلط ہے ۔ شاہ شہیدؒ کی عبارت کا قطعاً یہ مفاد نہیں، اللہ سے ڈریئے افترا کبیرہ گناہ ہے ۔ انما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون ۔

دوسری غلط بیانی ص۳ کے ایک حوالہ میں آپ نے لکھا ہے کہ شاہ شہیدؒ بارادہ ایصالِ ثواب اور

نذر وغیرہ کو بھی شرک سمجھتے ہیں ـــــ یہ قطعاً غلط ہے اور شاہ صاحب پر تہمت اور ضمیر کی چوری اس سے بھی ظاہر ہے کہ ـــــ "ایصال ثواب کے لیے" فقرہ آپ نے قوسین میں کر دیا ہے۔ لوگوں سے آپ ڈرتے ہیں کہ آپ کو جھوٹا نہ کہیں لیکن ایک ولی پر تہمت لگانے سے آپ کو خوف محسوس نہیں ہوا ـــــ ! لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا۔ شاہ صاحبؒ کی کسی عبارت سے آپ "ایصالِ ثواب" کو شرک ثابت کر دیں تو آپ کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف فرمائے جن کا پیشہ ہی یہ ہے کہ وہ اہلِ حق اور اولیاء اللہ پر افتراء کرتے ہیں۔

عقیدہ ۲ : حضرت شہیدؒ نے قبر کے لیے تعبدی سفر کو ناپسند فرمایا وہ اسے حج کے مماثل سمجھتے ہیں اور ایسے سفروں کو غیر مشروع سمجھتے ہیں۔ قبروں اور استھانوں میں الٹے پاؤں چلنا فطرتِ انسانی کے خلاف سمجھتے ہیں ـــــ جب تک شرعاً کسی مقام کی حرمت ثابت نہ ہو، اپنی طرف سے اس کی حرمت اور شرافت کا دعویٰ کرنا، شاہ صاحبؒ واقعی اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔ اگر بریلوی حضرات کو اس سے دکھ ہوتا ہے تو یہ آپ کی ذاتی رائے ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ تین مساجد کے علاوہ عبادت اور ثواب کے لیے سفر نہ کیا جائے ـــــ لا تشد الرحال الا الی ثلثة مساجد ـــــ صحیح حدیث ہے۔ متقدمین ائمہ سے یہ عقیدہ منقول ہے جیسے ابنِ قیم، ابنِ تیمیہ، عبداللہ بن مسعود، شوکانی محمد بن اسماعیل، امیر یمانی، علامہ آلوسی، صاحب جلاء العینین، حضرت شاہ ولی اللہ، البتہ بعض اہلِ علم کی رائے اس کے خلاف ہے ان کے ہاں یہ سفر درست ہے ـــــ اس وقت ہمارا مطلب کسی مسلک کی ترجیح نہیں، بلکہ یہ گزارش کرنا مطلوب ہے کہ یہ مسئلہ فقہی ہے اس میں اختلاف کیا جا سکتا ہے ـــــ ایسے مسائل میں تکفیر یا فتویٰ بازی کہاں درست ہے؟

اسی طرح الٹے پاؤں چلنا فطری وضع کے خلاف ہے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے :

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (ملک)	اوندھا چلنے والا ہدایت پر ہے یا سیدھا چلنے والا۔

ـــــ قدرت نے منہ اور پاؤں کا رخ ایک طرف رکھا ہے جو الٹے پاؤں چلتا ہے وہ فطرت سے بھی جنگ کرتا ہے۔

شاہ شہیدؒ سیدھی بات فرمائیں آپ کو وہ ناگوار ہوتی ہے۔ آپ کی اس ناگواری کا علاج نہ دیوبندی کر سکتے ہیں اور نہ حکومت، آپ کی قدرت سے جنگ ہے اور ناراضگی شاہ صاحبؒ پر!

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قابلِ عزت کون ہے؟ کوئی ایک واقعہ بتائیے کہ صحابہؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے بعد الٹے پاؤں چلے ہوں ـــــ آپ حضرات ہو چلیں آپ کو یہ اچھی بات بھی کیوں معلوم ہوتی ہے؟ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الٹا چلنے کا حکم دیا ہے وہاں حکم کی پابندی پر کسی کو اعتراض نہیں

پیغمبر کو سجدہ | شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ پیغمبر کو سجدہ کرنا شرک ہے ـــــ بریلوی حضرات نے شاہ صاحب پر اعتراض کیا کہ آدم کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ بھائیوں نے یوسفؑ کو سجدہ کیا ـــــ حالانکہ شاہ صاحب نے اس سوال کا جواب صـ۴۲ (مطبوعہ لاہور) پہ دے دیا ہے اس وقت اس کی اجازت ہوگی۔ اب نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہر قسم کے سجدے غیر کے لیے حرام پائے۔

اللہ تعالیٰ اور مخلوق | شاہ صاحب فرماتے ہیں، ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ تعالیٰ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔ (صـ۱۵) ـــــ بات سیدھی ہے مگر ٹیڑھی عقل کا یہ حال ہے کہ وہاں پہنچ کر ہر چیز ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ ہمارے بریلوی دوست مخلوق کی وکالت کرتے ہیں کہ مخلوق کی توہین ہوگئی اور یہ توہین شاہ شہیدؒ نے کی ـــــ لیکن قرآن مجید فرماتا ہے ـــــ

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم)

آسمان اور زمین کے سب لوگ اللہ کے سامنے ذلیل ہو کر پیش ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔

اے لوگو! تم سب محتاج ہو بے نیاز صرف اللہ ہے۔

بریلوی حضرات کا مقابلہ قرآن سے ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہے۔ دیکھیے ان کی کوششوں سے قرآن کب ضبط ہو؟

مختار با اختیار | شاہ صاحب نے تقویۃ الایمان میں کسی جگہ لکھا ہے کہ مختارِ مطلق صرف اللہ ہے۔ مخلوق نبی ہوں یا ولی، عالم ہوں یا جاہل، کسی کے اختیار میں کچھ نہیں جو ہوتا ہے اللہ کی مشیّت سے ہوتا ہے۔ انبیاءؑ صلحاء کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا ـــــ حقیقت یہی ہے جو شاہ صاحبؒ نے فرمائی۔ واقعی کسی مردے یا زندہ کو پکارنا فائدہ نہیں دیتا۔ یہ پکار بے کار ہے۔ یہ لوگ کسی کے نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۔ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۔ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۰-۲۲-۲۱)

ان سے کہہ دو میں صرف اللہ سے مانگتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں سمجھتا۔ مجھے تمہارے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہیں۔ مجھے اللہ سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ اس کے سوا میرے لیے کوئی پناہ کی جگہ ہے

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (یونس)

میں اپنے نفع اور نقصان کا بھی مالک اور مختار نہیں ہوں۔

پورے قرآن مجید میں یہ مضمون بھرا پڑا ہے۔ یقیناً قرآن مجید کا یہ طریق بیان آپ حضرات کے لیے دل خراش ہے۔ آپ کے اعتقادات کو اس سے گزند پہنچتا ہے۔ اس لیے ــــ ..... اگر پورا قرآن ممکن نہ ہو تو کم از کم سورۂ اخلاص، معوذتین، سورۂ کافرون، سورۂ نوح، سورۂ جن، سورۂ نحل، سورۂ یوسف وغیرہ کی ضبطی کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔

اس کوشش میں اگر آپ حضرات کامیاب ہو گئے ــــ تو تقویۃ الایمان مع کتاب التوحید خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مولانا رشید احمد، اشرف علی، شاہ شہید، محمد بن عبدالوہاب تو بچارے ناقل ہیں جب اصل ضبط ہو گیا، نقل خود بخود ضبط ہو جائے گی ــــ آپ کے ہاں ولیوں اور بزرگوں کی کمی نہیں ان کی وساطت سے کوشش فرمائیے ــــ کہ

قرآن عزیز کے یہ دل خراش حصے یوں منسوخ ہو جائیں۔

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور بڑائی

شاہ صاحب نے فرمایا ہے۔ انسان آپس میں سب بھائی ہیں جو بڑا بزرگ ہے وہ بڑا بھائی ہے، سو اس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجئے۔ (ص ۶۷)

پھر فرمایا، اولیاء، انبیاء، امام، امام زادے، پیر، شہید یعنی جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی ــــ مگر اللہ نے ان کو بڑائی دی، وہ بڑے بھائی ہوئے ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم ہوا ہے (ص ۶۷)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ (مشکوٰۃ)

یعنی ــــ رب کی عبادت اور اپنے بھائی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کرو۔

قرآن عزیز نے بھی انبیاء علیہم السلام کو بھائی سے تعبیر فرمایا۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (ہود عاد کے بھائی) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (صالح قوم ثمود کے بھائی)، شاہ صاحب نے ان کی برتری اور رہنمائی کی وجہ سے ان کو بڑا بھائی فرمایا ہے ــــ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (مومن بھائی ہیں)، ایمانی اخوت کے لحاظ سے بھی اہل اللہ اور انبیاء بڑے اور بزرگ ہیں اس لیے کہ ہم

لوگوں کو ایمان اور ہدایت ان کی وجہ سے ملے ہیں۔ اس لیے وہ بڑے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے سردار ہیں اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے الخ

شاہ صاحبؒ نے اللہ تعالیٰ کی شان کے متعلق فرمایا ہے۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ ایک آن میں ایک حکم ـــ کن ـــ سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی، جن اور فرشتے، جبریلؑ اور محمد کے برابر پیدا کر دے۔ اور ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے۔ (ص ۴۲)

سبحان اللہ! کس قدر ایمان افروز ارشادات ہیں۔ ایک مؤمن مؤحد کا اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار فرمایا اس نے آسمان، زمین اور ساری کائنات کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا۔

اِذَا قَضٰیٓ اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ	یعنی وہ جب کسی امر کا فیصلہ فرمائے تو اسے کن کہہ کر پیدا کر دیتا ہے۔

مؤمن مؤحد جس کا اللہ تعالیٰ پہ ایمان ہے اِن توحید آمیز کلمات سے اُس کے ایمان کتنا لگی ملتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و جبروت پہ اس کا ایمان پختہ ہوتا ہے۔ حضرات اولیاء کرام بھی مقامِ توحید کو ٹھیک اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح شاہ شہیدؒ نے فرمایا ـــ شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری علیہ الرحمہ ۳۵ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں۔

گر خواہد در ہر لحظہ صد ہزار چوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیافریند و ہر نفسے از انفاس ایشاں مقام قاب قوسین دہد جلال او ذرہ زیادہ نگردد و اگر خواہد در ہر نفسے ہزار چوں فرعون بیافریند تا دعوی انا ربکم الاعلیٰ کنند واز جمال و کمال او ذرہ کم نگردد۔ (ص ۹۶)	اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہر لمحہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کی طرح بلند مرتبہ ہزار لعل پیدا فرمائے اور ہر گھڑی میں انہیں قاب قوسین کے مقام مرحمت فرمائے۔ اس کے جلال و جبروت میں ایک ذرہ کا اضافہ نہیں ہوگا اور اگر وہ چاہے تو ہر سانس ہزار لاکھ فرعون پیدا فرمائے جو انا ربکم الاعلیٰ کا دعوی کریں تو اس کے حسن و جمال میں ذرہ بھر کمی نہیں آئے گی۔

پھر فرماتے ہیں۔

واگر خواہد ہر کہ در روئے زمین کافرے و مشرکیست در دریائے رحمت غرق کند از صفت قہر او ذرہ کم	اگر وہ چاہے تو دنیا کے تمام کفار و مشرکین کو اپنی رحمت کے سمندر میں غوطہ دے دے تو اس کی صفت قہر سے

نگردد و اگر خواہد ہر کہ در عالم نبی و ولی است ہمہ را دریک سلسلۂ قہر کشد خالدًا و مخلدًا در عذاب الیم بدارد از صفت رحمت او ذرہ کم نگردد۔ اھ (مکتوبات ص ۹۷)

ایک ذرہ بھی کم نہ ہوگا اور اگر چاہے تو تمام انبیاء اور اولیاء کو اپنے قہر میں مبتلا کر دے اور ہمیشہ کے لیے دردناک عذاب میں گرفتار فرما دے تو اس سے اس کی رحمت میں بھی قطعًا کوئی کمی نہیں آئے گی اھ

—— کس قدر بے ادبی ہے۔ معاذ اللہ ——

بریلوی سنت و جماعت والے حضرات کے عقاید کو ضرور ان کتابوں سے نقصان ہوگا۔ ان کے عقاید مجروح ہوں گے —— اگر حکومتِ پاکستان واقعی ان حضرات کو خوش کرنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ان کتابوں کے ساتھ قرآنِ عزیز اور سنت کے دفاتر اور اہلِ سنت صوفیوں کی کتابوں کا بھی بندوبست کرے۔ تاکہ بچارے بریلوی اکرام کی نیند سو سکیں۔ ان بچاروں کی پریشانی واقعی قابلِ صد ہزار رحم ہے۔

آخر میں تقویۃ الایمان کے متعلق فرمایا ہے۔ ساری کی ساری کتاب میں اسی قسم کی گستاخی اور بے ادبی کا مظاہرہ ہے اور شانِ رسالت و نبوت کا انکار کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک فتنہ ہے جس کی نحوست نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ اور اتفاق و اتحاد کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے اور اس کے باعث جگہ جگہ فتنہ بپا ہے (رضائے مصطفٰے ا)

کتاب میں گستاخی وغیرہ تو قطعًا نہیں، البتہ حفظِ مراتب کی تلقین کھلے طور پر کی گئی ہے۔ شاہ صاحبؒ کا مطلب یہ ہے کہ —— اولیاء کو انبیاء کا مقام مت دو —— اور انبیاء کو اللہ تعالیٰ کا مقام دے کر اللہ کو اپنے مقام سے معطل نہ کرو —— البتہ یہ درست ہے کہ اس کتاب سے بریلوی مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور بریلویت ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی —— شاہ شہیدؒ کی آواز واقعی سخت ہے۔ عالم اور مجددؒ میں یہی فرق ہے کہ علماء اپنی آواز سے بولتے ہیں۔ مجدد وقت کی آواز ہوتا ہے۔ وہ اس آواز سے بولتا ہے، وقت جس کا تقاضا کرتا ہے —— بریلوی حضرات کو شکایت تو خیر ہے ہی —— بعض اہلِ حدیث اور دیوبندی علماء نے بھی تقویۃ الایمان کے لب و لہجہ کو سخت سمجھا۔ یہ حضرات صلح کل اور عافیت کوش ہیں، انہیں معلوم نہیں اگر شہیدؒ آپ کی آواز سے بولتے تو ان کی آواز بھی آپ حضرات کی طرح بے اثر ہوتی۔

شہیدؒ کی آواز نے بہروں کو سنایا، گونگے بولنے لگے، جو آنکھوں سے معذور تھے وہ اس کی برکت سے دیکھنے لگے، حیران دلوں کو اس سے اطمینان نصیب ہوا۔ فقیروں، قبروں، درختوں، پیروں، ملاؤں کی پرستش سے اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلصی . . . عنایت فرمائی —— اس لیے واقعی بریلوی گھروں میں اختلافات بڑھ گئے۔ باپ، بیٹا، میاں، بیوی، بھائی بھائی سے جدا ہو گئے۔ وہی ہوا جو علم و بصیرت کی روشنی میں جہالت

کیسا تو ہوتا ہے۔ سورج کے طلوع سے رات کے اندھیروں پر جو گزرتی ہے وہی بریلوی حضرات پر گزری ــــ
علم و بصیرت کی آمد نے یہاں کی دنیا بدل دی۔ قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا:

فَمَا اخْتَلَفُوا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۰-۹۳)	بنی اسرائیل میں اختلاف تب پیدا ہوا جب علم و بصیرت نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اب ان کا فیصلہ قیامت ہی کو ہو گا۔ اھ۔

جب حق کا حملہ باطل کی بستیوں پر ہوتا ہے تو اس کا قدرتی اثر یہ ہوتا ہے کہ باطل پرستوں میں انتشار رونما ہو۔ حرص و آز اور درہم و دینار مداہن و کام کے بندے جب اپنا مفاد خطرے میں دیکھتے ہیں تو اس کی حفاظت کے لیے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ انتشار، پریشانی اور سراسیمگی ہوتا ہے۔ یہی اثر قرآنِ عزیز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد نے بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل پر کیا جس کا اعتراف ابوجہل نے محاربہ بدر سے پہلے ان لفظوں سے کیا:
اِنَّ مُحَمَّدًا شَتَّتَ اَمْرَ الْعَرَبِ۔

یہی حال شاہ شہیدؒ کی آواز سے ہند کے سرکستان میں ہوا ــــ مدیر محترم کی رائے سے ہمیں اتفاق ہے کہ تقویۃ الایمان کی آمد سے بریلوی سنت اور بریلوی جماعت کے متوسلین میں انتشار پیدا ہوا۔ لیکن یہ قصور تقویۃ الایمان کا نہیں، یہ "نحوست" علم و بصیرت سے ظاہر ہوئی ــــ اس لیے ضروری ہے کہ دنیا سے علم و دانش کو ضبط کر لیا جائے، اخلاص و دیانت کو نظر بند کر دیا جائے، حق و صداقت کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ ــــ یقیناً بریلوی حضرات کو اس سے آرام ملے گا۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ	آنکھوں کا بے نور ہونا چنداں مُضر نہیں۔ سب سے بڑی مصیبت دلوں کی بربادی ہے۔

ما شکل ان القیود علی الارجل
ان القیود علی العقول فتاک الشکل

اگر حکومت عقل و دانش، اخلاص و دیانت اور علم و بصیرت کو ضبط کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے تو اہلِ توحید بسر و چشم تیار رہیں گے۔

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

لیکن بریلوی حضرات کو یقین ہونا چاہیے کہ حکومت آپ کی آرزو کو پورا کرنے پر قادر نہیں، اس میں یہ ہمت ہی نہیں کہ وہ قدرت کے اٹل قانون کا مقابلہ کرے۔ ارشاد ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ	اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تم سب ایک جماعت ہو جاتے لیکن

یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۹۳)	اس کی مشیئت اس دنیا میں یہ ہے کہ اہلِ ہدایت اور گمراہ دونوں یہاں بسیرا رکھیں اور تمہارے اعمال کی بابت تم سے آخرت میں جواب سوال ہوں گے۔ ا ھ

مٹی میں ملنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس بن سعدؓ کو فرمایا:

اَرَاَیْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِیْ اَکُنْتَ تَسْجُدُ لَهٗ فَقُلْتُ لَا فَقَالَ فَلَا تَفْعَلُوْا (مشکوٰۃ)	بتاؤ جب تم میری قبر پر گزرو گے تو کیا تم اس پہ سجدہ کرو گے میں نے عرض کیا۔ قطعاً نہیں۔ اس پہ فرمایا پھر زندگی میں بھی مجھے سجدہ نہ کرو۔ ا ھ

شاہ صاحبؒ نے اس حدیث کے تشریحی نوٹ میں فرمایا ہے:

"میں ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ کے لائق ہوں"

مٹی میں ملنے کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں — قبر میں دفن ہونا کیونکہ قبر مٹی ہی میں بنائی جاتی ہے۔ یہ معنیٰ بالکل درست ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا انتقال کے بعد جسمِ اطہر کو سپردِ خاک فرمایا گیا۔ ام سلمہؓ فرماتی ہیں، ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا اس وقت یقین آیا جب قبر کھودتے وقت ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی —— اس معنی سے جو آدمی دفن ہوتا ہے وہ مٹی میں مل جاتا ہے۔ یہی مفہوم یہاں قرینِ قیاس ہے چونکہ حدیث میں قبر ہی کا ذکر ہے۔

مگر اس کا مطلب جسم کا مٹی ہو کر مٹی میں مل جانا ہے تو یہ معنیٰ غلط ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب کا یہ مطلب نہیں۔ ان کا مطلب قبر میں دفن ہونا ہے۔ شاہ صاحبؒ ایسے عالم سے یہ غلطی کیسے ہو سکتی ہے جبکہ حدیث میں صراحۃً موجود ہے ——

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ (مشکوٰۃ)	انبیاء کے جسموں کو کھانا زمین پر حرام ہے۔

تاہم اگر شاہ صاحبؒ کا مطلب یہی سمجھا جائے تو بداہۃً غلط ہے۔ شاہ صاحب انسان ہیں بھول سکتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ معصوم نہیں۔

کتاب التوحید تقویۃ الایمان کو کتاب التوحید کا ترجمہ کہنا تو قطعاً غلط ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ دعوت ایک ہی ہے جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے دی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو الفاظ کی بحث بے سود ہے۔ حقیقت کا اعتراف کیجیے۔ الفاظ کا انتخاب وقت کے لحاظ سے مؤلف کے اجتہاد پر موقوف ہوتا ہے۔ اپنے مخاطب کی قوتِ فکر کے مطابق اسے الفاظ پسند کرنے پڑتے ہیں یہ اس کی نیت کا مسئلہ ہے مجھے کتاب التوحید بالاستیعاب

پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اندازہ یہ ہے کہ محمد بن عبد الوہاب کا ماحول اسمٰعیل بن عبد الغنی کے ماحول سے کافی مختلف تھا۔ محمد بن عبد الوہاب کے قلم اور تلوار دونوں کا رُخ ایک ہی طرف رہا اس کے قلم کو شکوہ نہیں کہ تلوار نے میرا ساتھ نہیں دیا ——— لیکن شاہ شہیدؒ کے قلم کو یہ بجا شکوہ ہے کہ اسمٰعیل کی تلوار نے قلم کو تنہا چھوڑ دیا۔ تلوار ہمیشہ سکھوں اور انگریزوں سے مخاطب رہی اور اسمٰعیل کے قلم کو بعض اوقات دونوں ڈیوٹیاں دینی پڑیں۔ دونوں ذمہ داریاں بقدر امکان اٹھانی پڑیں۔

اگر شاہ شہیدؒ کی تلوار کا رخ کچھ دیر بریلی اور بدایوں کی طرف ہو جاتا اور قلم کو اس طرح تلوار کی رفاقت نصیب ہو جاتی تو ان حلوے کے شیروں کو قلم سے شکوہ نہ ہوتا ——— مصیبت تو یہی تھی کہ سکھ اور انگریز دونوں بریلی اور بدایوں کی پشت پر تھے اس لیے قلم کا محاذ تلوار کے محاذ سے زیادہ سخت تھا اور اسمٰعیل کے قلم نے جس زمین کو فتح کیا وہ تلوار کے میدان سے زیادہ سنگلاخ تھی ——— جو سپاہی بیک وقت چار محاذوں پر لڑ رہا ہو اس کی تلخ نوائیوں کا شکوہ دیوبند سے ہو یا بریلی یا بدایوں سے ہو یا دہلی سے، بے انصافی ہے ؎

گفتگوئے عاشقاں در باب رب   جذبۂ عشق است نے ترکِ ادب

شہیدؒ کی مشکلات کا جائزہ لبِ جو بیٹھ کر کر لینا بے انصافی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ بریلی اور بدایوں کے حریف اور دیوبند اور دہلی کے رفقاء اس معاملہ میں خاموش ہو جائیں انما یعرف البلاء من به یبتلی جو لوگ وقت پر مفید نہیں ہو سکے وہ مضر کیوں ہوں۔

کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے تقابل کی بحث بے سود ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو ان کے اعمال کی بہتر جزا دے۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

صراطِ مستقیم "صراطِ مستقیم" کے مصنف شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نہیں ہیں جیسے کہ کتاب کے دیباچہ سے ظاہر ہے۔ دراصل سید احمد شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات ہیں جن کی ترجمانی فارسی زبان میں شاہ شہیدؒ اور حضرت مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہما نے فرمائی۔ اس کتاب کے کل چار باب ہیں۔ پہلا اور چوتھا باب شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا دوسرا اور تیسرا باب حضرت مولانا عبد الحی نے رقم فرمایا اور اس فارسی ترجمانی کے بعد حضرت سید احمد رحمۃ اللہ کو سنا کر اس امر کی تسکین فرمائی کہ ان کا مقصد ادا ہو گیا۔

اس لیے اس کتاب کو شاہ شہیدؒ کی تصنیف کہنا غلط ہے۔ سید شہیدؒ کی تصدیق کے بعد اس کے الفاظ اور معنی کی ذمہ داری ترجمان حضرات سے زیادہ سید احمد رحمۃ اللہ علیہ پر پڑتی ہے۔ بریلوی حضرات اسے شاہ شہیدؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ واقع میں غلط ہے۔ بریلوی مدیر نے قابلِ ضبط کتابوں کا تذکرہ کرتے

وقت اسے شاہ صاحبؒ کی تصنیف ظاہر کیا ہے یہ غلط بیانی ہے۔

تحریک حریت فکر اور حریت وطن اور تحریک اعتصام بالسنۃ اسی تحریک کے اہم اجزاء تھے جو گیارھویں صدی کے اواخر سے آج تک مختلف محاذوں پہ کام کرتی رہی۔ اس کے بانی یقیناً سید احمد شہیدؒ تھے لیکن اس کے روح رواں شاہ شہیدؒ تھے جب تک شاہ شہید زندہ رہے تحریک کے ہر حصہ میں سید صاحب کے ساتھ پیش پیش رہے۔ شہادت کے بعد اس کی تمام تر ذمہ داریاں پٹنوی خاندان نے سنبھال لیں۔ یہ حضرات شاہ شہیدؒ سے زیادہ متأثر تھے اور کھلے اہل حدیث تھے اس لیے ہندوستان کے اہل بدعت، سکھوں اور انگریزوں نے ہر گناہ (ان کے خیال سے) کو شاہ شہیدؒ اور جماعت اہل حدیث پہ چسپاں کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک حوالہ کی وجہ سے پوری کتاب شاہ شہیدؒ کے نام لگا دی گئی حالانکہ یہ حوالہ دوسرے باب میں جو مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کا مرہون منت ہے شاہ شہیدؒ کو اس سے کوئی تعلق نہیں انہوں نے دوسرا اور تیسرا باب من و عن رکھ دیا اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں فرمائی —— یہ اظہار حقیقت کے طور پہ عرض کیا گیا۔ اعتراضات سے طبیعت پہ بحمداللہ کوئی بار نہیں۔

شاہ شہیدؒ کے علم و فضل کے اعتراف کے باوجود ہم ان کا مقام ائمہ مجتہدینؒ سے کم سمجھتے ہیں۔ آئمہ مجتہدین کے ارشادات کو جب من و عن قبول نہیں کیا جاتا تو ان بزرگوں کی ہر بات کی ذمہ داری ہم پہ کیوں عائد ہوگی؟ نہ شاہ اسمٰعیلؒ معصوم ہیں نہ سید احمدؒ اور نہ مولانا عبدالحی رحمہم اللہ۔

اصل کتاب کے متعلق گزارش | صراط مستقیم تصوف کی کتاب ہے۔ تصوف پہ دو دور گزر چکے ہیں، ایک دور قرون خیر کا۔ تمام صحابہ اور عموماً تابعین اور ائمہ اسلام صوفی تھے۔ ان کے ہاں تصوف زہد و ورع، دنیا سے ایک گونہ بے رغبتی کا نام ہے۔ یہاں نہ چلہ کشی ہے نہ دم کشی کی ورزشیں نہ طویل مراقبے یہاں ان تمام کمیوں اور سارے خلاء کو پاٹنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یا اس زمانہ کا قرب کفایت کرتا ہے۔ جہاد اور دوسرے اعمال کی وجہ سے یہ دور ان مصنوعی اور مصطلح ورزشوں سے مستغنی رہا۔

عمھم اللہ برحمۃ وادخلھم بحبرحۃ الجنۃ۔

مصطلح تصوف | قرون وسطیٰ میں تصوف زمانہ نبوت سے بہت دور ہو گیا۔ اس دوری کے سبب سے نبوت کی برکات کا اثر کم ہوتا گیا۔ اس وقت اہل علم نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کچھ وظائف اور کچھ مراقبے وضع فرمائے بعض کوائف کے اظہار اور تفہیم کے لیے کچھ اصطلاحات وضع فرمائیں۔ اور اس سلسلہ میں اسلام کے سواد وسرے مذاہب کی رہبانیت سے بھی استفادہ کیا یہ چیزیں اس وقت دین نہیں سمجھی جاتی تھیں بلکہ ضرورتاً ان سے استفادہ کیا گیا۔ قلب پران کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا اس پہ مفید نتائج مرتب ہوئے اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ امام غزالی

ایسے یگانۂ روزگار نے نظامیہ کی صدر مدرسی سے مستعفی ہو کر دمشق کے جنگلوں میں پناہ لی اور اس تنہائی اور خلوت میں مصطلح راہوں سے خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور یہ راہ فلسفہ اور کلام کی راہ سے ان کے لیے زیادہ اطمینان کا موجب ہوئی۔ یہ راہ سنت نہ سہی فی الجملہ مفید تھی بشرطیکہ ان ورزشوں کو محض ذریعہ سمجھا جائے دین اور شریعت نہ تصور کیا جائے۔

دکان داری آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں تصوف نے بزنس اور دکان داری کی صورت اختیار کر لی ہے اور تصوف کے پردے میں زناکاری، حرام خوری اور منشیات کی تجارت ہو رہی ہے یہ دین کے قائد، زہد اور ترکِ دنیا کے رہنما گندی قسم کے دنیا پرست ہیں۔ یہاں بیعت اور خانقاہ اور وجد و حال کی مجالس دکان کے سامان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ عوام کو دھوکہ دینے کے لیے یہ سب ہم رنگِ زمین جال ہیں۔ بریلوی حضرات میں تو اس سلسلہ نے انتہائی ذلیل صورت اختیار کر لی ہے۔ پیر کا فسق و فجور دیکھ کر بھی دم مارنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ گویا یہاں پہنچ کر امر بالمعروف کی ساری ذمہ داریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ تصوف مستند نہ ہے اس کا شرعاً احترام ہے نہ آبرو، بلکہ اگر اس ملک میں اسلامی اور شرعی قانون رائج ہو تو یہ لوگ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح تادیب اور تعزیر کے مستحق قرار پائیں۔

کتاب "**صراطِ مستقیم**" قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی یادگار ہے اس میں مختلف قسم کے اوراد، مشقیں اور تصوف کی اصطلاحات پر گفتگو فرمائی گئی ہے۔ سید شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بہت سی بدعات کی اصلاح بھی فرمائی ہے، تصورِ شیخ ایسی مشرکانہ بدعات سے روکا ہے تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ تصوف مسنون ہے اس لیے سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ سے انتہائی عقیدت کے باوجود اس کے پورے الفاظ کی ذمہ داری لینا مشکل ہے۔

اخلاق کی اصلاح یہ ایک علمی کتاب ہے۔ اخلاق کی اصلاح کے لیے بہترین مجموعہ ہے۔ دینی ذہن اور شریعت کے ساتھ رابطہ کے لیے نہایت اچھی کتاب ہے اس سے بہترین اخلاق کی تلقین ہوتی ہے۔ ایسی کتاب کے ضبط کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ تصوف کی گہرائیوں میں جا کر اس سمندر نے ایسے موتی پیدا کیے ہیں جن کو پیر پرستی کا عادی عامی ذہن پورے طور پر سمجھ نہیں سکتا ——— مناسب تو یہ تھا کہ اسے کند ذہن اور جہالت نواز حضرات سے چھپایا جاتا مگر اس کا کیا علاج کہ پریس نے اسے حدیثِ محفل بنا کر رکھ دیا اس لیے ہر کس و ناکس اس کے متعلق اظہارِ خیال کے لیے آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے بریلوی حضرات نے اسے الزام اور استدلال دونوں طریق سے استعمال کیا۔ اب بریلوی مدیر نے مشورہ دیا ہے کہ یہ کتاب بھی ضبط کر دی جائے اور اس کی اشاعت قہر القادر کے ساتھ ممنوع قرار دی جائے۔

اصل شبہ سید صاحبؒ نے نماز میں حضورِ قلب پر زور دیا ہے اور مختلف وساوس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے وساوس کے لیے علاج تجویز فرمائے ہیں۔ اس ضمن میں سید صاحبؒ نے ایک نکتہ پیدا فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ معمولی قسم کی ذلیل چیز کا خیال اگر دل میں آجائے تو اسے رفع کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ انسان حقارت سے اسے نظر انداز کر سکتا ہے لیکن قابلِ عزت و احترام بزرگوں کی طرف دل کی مشغولیت بڑھ جاتی ہے اسے روکنے میں دقت ہوگی اس کا احترام اس کے دفاع میں حائل ہوگا دل نماز سے ہٹ کر اس طرف مشغول ہو جائے گا اس سے نماز میں خلل واقع ہوگا وہ ہر کس و ناکس کے تصور کو گاؤخر سے تعبیر فرماتے ہیں۔ —— وہ فرماتے ہیں کہ مقام تعبد میں دل کو پوری یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ یہاں نہ معمولی خیالات کے لیے گنجائش ہونی چاہیے نہ انبیاء و اولیاء کا تصور مقامِ تعبد میں حائل ہونا چاہیے بلکہ غایتِ احترام کی وجہ سے بزرگوں کی طرف دھیان کا جانا نماز اور حقیقتِ عبادت کے لیے زیادہ مضر ہے —— مسئلہ صاف ہے۔ مثبت طریق پر بریلوی حضرات کو سمجھانے کی بے حد کوشش ہوئی اور پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے علماء سمجھتے ہیں کہ جو فرمایا گیا ہے حقیقتاً درست ہے —— وہ عوام اور جہلاء کو بدگمان کرنے کے لیے ایسے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ خواص کو اس کی حقیقت معلوم ہے کہ اس میں کچھ نہیں اس لیے مثبت طور پر میں اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا میں الزامی طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کند ذہن اور شرارت پسند طبائع کے لیے عموماً یہ طریق مفید ثابت ہوتا ہے اس طرح ان کی قوتِ فکر بیدار ہو جاتی ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ سید احمد صاحب نے گاؤخر اور انبیاء اور اولیاء کے خیالات کا تقابل کیا ہے اور انبیاء کے خیال کو گاؤخر سے نماز میں زیادہ مضر سمجھا ہے ایک عامی ذہن کو واقعی یہ تقابل کھٹکتا ہے۔

"الاشباہ والنظائر" فقہ کی مسلمہ کتاب ہے بریلوی حضرات اسے پورے یقین اور اعتماد سے مانتے ہیں۔ اس میں مرقوم ہے:۔

ولو نظر المصلی الی مصحف وقرء منہ فسدت صلوٰتہ لا الی فرج امرأۃ بشھوۃ (ص۳۴۴)	یعنی نمازی قرآن کو دیکھ کر پڑھے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ عورت کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو نماز نہیں ٹوٹتی۔ اھ۔

قاضی خان فرماتے ہیں۔

اذا قرء المصلی من المصحف فسدت صلوٰتہ فی قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ ص۱۱۱ مطبوعہ مصر

ولو نظر الی فرج المطلقۃ طلاقا رجعیا بشھوۃ یصیر مراجعا ولا تفسد صلوٰتہ ص۱۱۱ ج۱ مصری	یعنی اگر مطلقہ رجعیہ کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو رجوع ہو جائے گا نماز فاسد نہیں ہوگی۔

وكذا لو نظر المصلى الى فرج امرأة بشهوة حرمت عليه امها وابنتها ولا تفسد صلوته فى رواية (ص ۱۱۱ ج ۱ مصر)

اگر آدمی کسی عورت کی شرمگاہ شہوت سے دیکھے تو اس کی ماں اور بیٹی اس پر حرام ہو جائے گی لیکن نماز فاسد نہیں ہوگی اھ۔

ولو نظر انسان من تحت القميص رأى عورته المصلى لا تفسد صلوته ص ۱۱۱

اگر آدمی قمیص کے نیچے سے نمازی کی شرمگاہ دیکھے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔

ولو قبلت المصلى امرأة ولم يشتهها لم تفسد صلوته (ص ۱۱۱ ج ۱)

عورت کسی نمازی کا بوسہ لے لے اور اسے شہوت نہ آئے تو نماز فاسد نہیں ہوگی اھ۔

ان ملفوضات پر غور کرنے سے چند چیزیں ثابت ہوتی ہیں :۔

۱ــــ یہاں قرآنِ حکیم کی قرأت کا تقابل عورت کی شرمگاہ، مرد کی شرمگاہ اور عورت کے بوسے سے کیا گیا ہے۔

۲ــــ فتویٰ یہ دیا گیا ہے کہ قرآن پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی شرمگاہ کی زیارت سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

۳ــــ شرمگاہ پر نظر سے رجوع اور حرمتِ مصاہرت تو ثابت ہو جاتی ہے مگر نماز پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور قرآن کا اثر فوراً نماز پر ہوتا ہے اور نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

۴ــــ عورت مرد کا بوسہ لے عدمِ اشتہار کی صورت میں نماز پر اثر نہیں پڑے گا۔

لم يشتهها کی قید قابلِ غور ہے اگر کسی پڑھے لکھے دیوبندی نے آپ کو سمجھا دیا تو شاید شہید کے متعلق بدگوئی سے آپ کو نجات مل جائے۔ مولانا اشرف علی اور دیگر علماء دیوبند کی کتابوں کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے۔ آپ کا سارا زور تقویۃ الایمان پر تھا اس کے متعلق اختصار سے عرض کر دیا گیا۔ ولو استزدتم فلدينا مزيد۔

الاعتصام : ۲۷، دسمبر ۱۹۵۷ء
: ۴، اکتوبر "
۱۱، اکتوبر "

ت کے
جس کا
شمارے میں